خدا بخش

بیمۂ زندگی جن کی زندگی کا مقصد تھا

وہ ایک حسین اور سنہری شام تھی جب خدا بخش مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے ہمیں ڈھاکے کے ہوٹل سے رات کے کھانے کی
وت پر لے جارہے تھے، جورات شروع ہونے سے قبل ہی شروع ہونے والی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ، یعنی میرے ساتھی خدا بخش
رحوم کی بیوہ بھی تھیں۔ یہ مارچ ۱۹۹۸ء کا واقعہ ہے۔ میں اور میری بیوی پینتیس برس سے زیادہ عرصے کے بعد اس خطے میں گئے تھے جواب
گلہ دیش کے نام سے موسوم ہے۔ ای ایف یو میں ملازمت کے دوران ڈھاکے اور چاٹگام برابر آنا جانا رہتا تھا۔ بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت
ں لیے جانے سے قبل جنرل اور لائف انشورنس دونوں کو جڑواں بچوں کی طرح ایک چھت کے نیچے کام کرتے دیکھنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ کراچی
کے مقابلے میں وہاں کا موسم بہت مختلف ہوتا تھا۔ موسمیات کے اعتبار ہی سے نہیں وہاں کے لوگ مختلف تھے اس لیے وہاں کا سیاسی موسم بھی
تلف ہوتا تھا۔ میں نے بنگالیوں کو بہت نرم دل پایا ہے، اپنی قوم کے دوسرے صوبوں، پنجاب اور سندھ کے لوگوں سے زیادہ ملنسار، مگر جلد
مڑک اُٹھنے والے۔ ان کے اطراف زود حسی کا ایک ہالہ سا ہوتا ہے جو کبھی تو ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا متوقع ہوتا ہے کہ ان پر
یار آنے لگتا ہے۔ ایک بنگالی کبھی ساکت نہیں بیٹھ سکتا، ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ ان کے جسم کا کوئی نہ کوئی عضو متحرک ضرور ہوگا، ٹانگیں،
تھ یا اِدھر اُدھر دیکھنے والی، ہمیشہ کی سوالی آنکھیں۔ جتنے بنگالیوں سے میں واقف رہا ہوں ان میں سے بیشتر اس تعریف پر پورے اُتریں
گے۔ اگر ان کے نزدیک یہ تعریف ایک گستاخی کے مترادف ہو تو میں سنجیدگی سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یقیناً میں کبھی ایسا کرنا نہیں چاہوں
گا۔ دراصل یہ کہہ کر میں بنگالیوں سے اپنی محبت اور پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہندوستانیوں کی دانشورانہ اور سیاسی ترقی میں
ندیوں اپنا کردار بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور ان کو اس کا صلہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر اکثر ان کو سستے وقتی فائدے پر اپنی خودداری کی قربانی
ینے سے انکار پر بڑے نقصانات بھی اٹھانے پڑے ہیں۔

زبید الرحیم نے میرے دوست خدا بخش کی یاد تازہ کردی تھی۔ وہی کاٹھی، وہی دوستانہ انداز اور ویسا ہی تبسم۔ جوں ہی آپ اس
سے ملیں آپ کو احساس ہو جائے کہ اس شخص پر بھروسا کیا جا سکتا ہے، اور کسی تردّد کی ضرورت نہیں۔ حقیقتاً ایک پُرسکون سا احساس ہوتا ہے۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں جب اس ادارے میں شرکت کی تھی ان کے والد ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ میں نے
ن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک ممتاز سیلز مین تھے، جو زندگی کے بیمے کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ لوگ کہتے
تھے، وہ بیمے کے خبط میں مبتلا تھے۔ سراپا بنگالی، بوٹا سا قد مگر سب کے لیے بڑا سا دِل، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو بیمے کے علاوہ اور کچھ سوچ
ں نہ سکتے ہوں۔

جناب خدا بخش مشرقی بنگال کے ایک چھوٹے سے شہر فرید پور میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس شہر نے بہت سے مشہور لوگ

پیدا کیے ہیں، جن میں بنگلہ دیش کے بابائے قوم مجیب الرحمٰن بھی شامل تھے۔ خدا بخش کی ابتدائی زندگی اس علاقے کے ایک عام آدمی جیسی تھی۔ وہ ایک کم حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد چاول کے گودام میں کام کرتے تھے اور ان کو اپنے پیشے میں کسی قسم کی ترقی کے مواقع نہیں ملے۔ خدا بخش کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں ہوئی تھی جہاں سے وہ سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کے امتحان میں، ریاضی میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے تھے۔ مزید تعلیم کے لیے وہ کلکتے گئے، اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے مزید اسناد حاصل کیں۔ وہاں بھی وہ اوّل درجے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والے پریزیڈینسی کالج میں داخلہ لیا مگر مزید اعلیٰ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اس لیے کہ وہ شدید بیمار ہوگئے تھے۔ اس پورے عرصے میں وہ ایک متوسط طبقے کے بنگالی خاندان کے ساتھ، اجرت کے عوض، رہتے تھے۔ مگر بجائے نقد رقم ادا کرنے کے، ان کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے غریب والد پر زیادہ مالی بوجھ نہیں ڈالا جن کی خود اپنی گزر بسر ہی مشکل سے ہوتی تھی۔ اگر ان کے والد کو ورثے میں کچھ زمین نہ ملتی جس کو بیچ کر وہ خدا بخش کی اعانت نہ کرتے تھے تو شاید ان کو اتنی تعلیم بھی میسر نہ آتی۔

اپنے اساتذہ کے مشورے پر انھوں نے پریزیڈینسی کالج کے کتب خانے میں دس ٹکا ماہانہ مشاہرے کی ملازمت اختیار کرلی، جو اس زمانے کے معیار سے بھی کوئی زیادہ تنخواہ نہیں تھی۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو اپنے مشکل ایام کے حالات سناتے رہتے تھے اور اس میں انھیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ کس درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے کارکنوں اور فیلڈ افسروں کو اپنے گھریلو حالات سناتے ہوئے دیکھا تھا، اور وہ اس پر بہت زور دیتے تھے کہ وہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات سے سبق حاصل کریں اور مشکل حالات میں ہمت نہ ہاریں۔

انھوں نے کتب خانے میں اس وقت تک کام کیا جب تک کہ اس زمانے کی مشہور بیمہ کمپنی، اورینٹل گورنمنٹ سیکیورٹی لائف ایشورنس کمپنی میں ملازمت نہیں مل گئی تھی۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے، جب ان کی عمر چوبیس برس کی تھی اور وہ پہلے مسلمان تھے جو اس کمپنی کی فیلڈ فورس میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی تنخواہ اس وقت تیس ٹکا تھی، یعنی پچھلی تنخواہ کا تین سو فی صد۔ ان کے ایک اچھے دوست نے یہ مشورہ دیا تھا جس کا خیال تھا کہ جس انداز سے وہ لوگوں سے ملتے جلتے اور باتیں کرتے اور ترغیب دینے کی اعلیٰ درجے کی صلاحیت رکھتے تھے، وہ زندگی کے بیمے کی فروخت کے پیشے میں بہت کامیاب رہیں گے۔ اور ان کے دوست کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ خدا بخش اس کمپنی کے اعلیٰ درجے کے کامیاب سیلز مین بن گئے اور پاکستان ہجرت سے قبل سترہ برس تک اس ادارے میں کام کیا۔ انھوں نے ڈھاکے میں، جو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا، سکونت اختیار کی اور ایسٹرن فیڈرل یونین میں شامل ہوگئے۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ کمپنی کو ان دنوں لائف انشورنس کے ایک ایسے تجربے کار آدمی کی تلاش تھی جو مشرقی پاکستان میں بھی کمپنی کو انھی خطوط پر استوار کرسکے جس طرح وصال الدین نے ملک کے مغربی حصے میں کیا تھا۔ وہ کمپنی کے منیجر فار ایسٹ پاکستان مقرر ہوئے اور انھوں نے اس ادارے کو وہاں تقریباً ابتدا سے استوار کیا۔ اس وقت کمپنی کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر اِروِن سی آئیون تھے جنھوں نے اپنے مشترکہ دوستوں کے سلسلے سے اس متحرک سیلز مین کو تلاش کیا اور اس کو اپنے ادارے میں لے آئے۔ بہت جلد ہی خدا بخش کا نام گھر گھر مشہور ہوگیا اور فطری طور پر جگہ خالی ہونے پر وہ EFU کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کے لیے موزوں ترین آدمی تھے۔ وہ ۱۹۵۹ء کے آس پاس کراچی آگئے تھے مگر انھوں نے ڈھاکے کا اپنا گھر نہیں چھوڑا تھا، جہاں ان کے اہلِ خانہ مقیم رہے۔ ان کی اہلیہ اکثر کراچی آتی تھیں۔ خدا بخش کو کراچی کبھی پسند نہیں آیا۔ یہاں انھوں نے خود کو ہمیشہ اجنبی محسوس کیا۔ مگر انھیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی اس لیے کہ، ان کے بیٹے کے الفاظ میں، ''انھوں نے آدھی رات سے قبل شاید ہی کبھی کوٹ پتلون اتارے ہوں گے۔ ان کا یہ ہر روز کا معمول تھا۔ میں نے ان کو کبھی تھکا ہوا نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ اپنے کام میں الجھے رہتے تھے، اس کے بارے میں ہمیشہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لائف انشورنس ان کی زندگی کا مشن تھا۔ وہ صحیح معنوں میں انشورنس کی مصنوعات پر

ایمان رکھتے تھے، انھوں بیمہ پالیسی کو کبھی صرف ایک معاشیاتی تجویز نہیں تصور کیا، جو بنیادی طور پر ایجنٹ کے لیے کمیشن کمانے کا ذریعہ ہوتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے وہ اور ان کے افسرِ اعلیٰ مسٹر بھیم جی ایک جیسے انسان تھے، ایک ہی جیسا سوچتے تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ لائف انشورنس کا پیغام مشرقی اور مغربی پاکستان، دونوں کے کونے کونے تک پھیل جائے۔ دونوں کا ایقان تھا کہ اس طرح وہ ملک کے لیے سماجی خدمت کر رہے ہیں۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کو کوئی شے فروخت کرنی ہو تو خود اس شے کے معیار پر یقین ہونا چاہیے اور اس پر بھی کہ خریدنے والے کو اس کی رقم کی پوری قیمت مل رہی ہے۔ میں نے اپنے کاروباری معاملات میں ہمیشہ ان کے مشورے پر عمل کیا ہے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اپنے پیشے میں، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، کامیاب ہونے کے لیے ہر سطح پر ذاتی تعلقات استوار کرنے ہوتے ہیں۔ پیشہ ورانہ سطح پر انسانوں سے ذاتی رشتے قائم کرنا کامیابی کی کلید ہے۔ میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ ان کا فیصلہ کُن مشورہ میری کاروباری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔"

جناب معین الدین کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں جنرل منیجر کے عہدے پر ان کی بھی ترقی ہوگئی تھی۔ ایک جنرل انشورنس کا اور دوسرا ترقی پذیر لائف انشورنس کا سربراہ بنا۔ اس طرح ان کو ادارے کی انھوں نے جس کو اتنے بڑے کاروباری حجم کا اور مالیاتی اعتبار سے اتنا طاقتور بنا دیا تھا، اعلیٰ ترین خدمت کا صلہ مل گیا۔ اس وقت کمپنی سے میرا چل چلاؤ تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کتنا مطمئن اور خرم تھا جب اس فیصلے کا اعلان کیا گیا تھا۔

جسمانی طور پر منحنی ہونے کے باوجود کامیابی میں وہ بہت بڑے آدمی تھے اور انشورنس کے میدان میں ان کا نام بہت بڑا تھا۔ اپنے پیشے سے انھیں بے انتہا اُنس تھا اور وہ اپنی پوری استطاعت سے اس کی خدمت کرتے تھے۔ اپنی ظاہری ہیئت میں وہ سراپا انکسار تھے، اور ہمیشہ رہے جب کہ اپنی سادگی اور اپنے خلوص کے باعث وہ اپنی جسامت سے کہیں بڑے دکھائی دیتے تھے۔

ان سب خصوصیتوں کے باوجود بہکاوے کے لیے ان کے سامنے بہت سی ترغیبات تھیں۔ ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہونے اور کمپنی کا اتنا بڑا بوجھ اٹھائے ہونے کے ناتے ان کے کاروباری قد میں بہت اضافہ ہوگیا تھا، وہ بہت بڑے آدمی بن گئے تھے۔ وہ ایوب خان کی صدارت کا دور تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان تلخیوں کے باوجود دونوں کے کاروبار چل رہے تھے۔ عام طور پر ملک کا مشرقی بازو، مغربی سرمائے، اہم عہدوں وغیرہ کے معاملے میں اپنی حق تلفی کا ذمے دار مغربی بازو کو ٹھہراتا رہتا تھا، جو کسی حد تک درست بھی تھا۔ عوام کے مطابق ایوب خان ان حالات سے واقف تھے اور وہ ان حق تلفیوں کے ازالے کی کوششیں ضرور کرتے رہتے تھے۔ ایک بار جب اُنھیں وفاقی وزیرِ تجارت کے لیے کسی آدمی کی تلاش ہوئی تو اُن کے سامنے خدا بخش کا نام پیش کیا گیا تھا۔ ظاہرہ وجوہات کی بنا پر نہ صرف اس لیے کہ خدا بخش کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، اتفاق سے وہ فرید پور جیسے چھوٹے سے ضلعے سے بھی تعلق رکھتے تھے بلکہ وہ ایک ایمان دار انسان کے طور پر مشہور بھی تھے۔ یہ ساری خصوصیات ان کو اس عہدے کے لیے مناسب ترین امیدوار کے طور پر پیش کرتی تھیں۔

جس شخص نے بھی ایوب خاں کو ان کا نام پیش کیا تھا اس نے غلط کام تو کیا تھا مگر صحیح وجوہات کی بنا پر۔ اس لیے کہ خدا بخش اگر کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے تو وہ یقیناً سیاست تھی۔ وہ بہادر آدمی تھے۔ ایوب خان سے ملاقات کے لیے اسلام آباد گئے۔ دورانِ ملاقات جب ان کو عہدے کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے جواب دیا، "جنابِ صدر، آپ غیر متوقع طور پر مجھے ایک بڑا اعزاز بخشنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے لیے زندگی بھر میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ مگر مجھے آپ سے، اپنی تمام تر انکسار کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ میرے نزدیک یہ ایسا کام نہیں جس کو میں قبول کرلوں۔ میں سیاست داں نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ یہ ایک عارضی عہدہ ہے اور زندگی بھر میں نے ایسے عہدوں سے نفرت کی ہے۔" ایوب خان نے ان کی بات کا بُرا نہیں مانا بلکہ ان سے پوچھا کہ ان کی نظر میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس عہدے کے لیے موزوں ہو، خصوصاً فرید پور سے۔ خدا بخش نے اپنے ایک دوست جناب وحید الزماں کا نام پیش کیا، جن کو یہ عہدہ دے دیا

گیا۔ وحید الزماں صاحب نے نہ صرف یہ عہدہ قبول کرلیا بلکہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ایک بڑے کنونشن کی صدارت کرنا بھی قبول کرلیا۔

اس عظیم شخصیت کی ایک اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی اپنے صلاحیتوں کے بارے میں بڑا بول نہیں بولا۔ ظاہر ہے کہ ہم سب کو، جوان کے ساتھیوں میں سے تھے، خدا بخش کی ایوب خان سے ملاقات کا علم نہیں تھا مگر ہم سب اس بات پر ضرور حیران تھے کہ وقت کا وزیرِ تجارت، کمپنی کے کنونشن کی صدارت کی کرسی سے، اپنے ابتدائی مدرسے کے ساتھی کے بارے میں اتنے اچھے الفاظ کیوں کہہ رہا ہے۔ ہم سب حیران تھے کہ وزیر با تدبیر، اس شخص کے مقابلے میں، جو کمپنی کے کاروبار کے 'شو' کے سب سے اہم اور بڑے کردار (روشن علی بھیم جی) کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی خدا بخش کی توصیف میں رطب اللسان کیوں ہے۔ وزارت کے منصب کو ٹھکرانا خدا بخش کے لیے اچھا ثابت ہوا کہ چند مہینے بعد ہی جنرل یحییٰ صدر بن گئے اور اگر انھوں نے اس کو قبول کرلیا ہوتا تو ان کے لیے یہ عہدہ واقعی کچھ زیادہ ہی عارضی ہوتا۔ ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ کو سونپ دیا تھا اور اس شخص (ذوالفقار علی بھٹو) کے لیے بلا واسطہ اقتدار کی راہیں ہموار کر دی تھیں جس کو اپنے دورِ اقتدار میں انھوں نے بہت چڑھایا۔ ان وجوہ سے قطعِ نظر، خدا بخش اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس عہدے کے لیے موزوں نہیں تھے۔ ان کے قریب ترین ساتھی بھی خدا بخش کو سیاست میں، اور ان لوگوں سے جو اقتدار کے مرکز میں سرگرمِ عمل تھے، الجھتا دیکھ کر حیران ہوتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا بخش بڑی قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ اور انھیں زندگی بھر اپنے بنگالی ہونے پر فخر رہا۔ وہ یہ بات ان لوگوں پر بھی واضح کر دیا کرتے تھے جن کو ایسی باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کمپنی کی انتظامیہ کی ملاقاتوں میں بھی وہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ یہ پیغام دے دیتے تھے کہ ان کے اور بنگالی سیاست دانوں کے خیال کے مطابق، من حیث الکل پاکستان کی ترقی میں مشرقی پاکستان کے بڑے حصے کا واضح اعتراف کیا جانا چاہیے۔ کبھی کبھی وہ اس حد تک جذباتی ہو جاتے تھے کہ ان جیسے رتبے کے افسر سے اس کی توقع نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب وہ جان بوجھ کر اپنے ذاتی جذبے اور عزم کے ساتھ کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے کسی مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ انھیں سیاست میں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ان کے اس انداز کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ جب بھی مرکزی حکومت یا قومی اسمبلی میں سے کوئی مشرقی پاکستانی مسٹر بھیم جی سے ملاقات کے لیے آتا، ایسی ملاقاتوں میں خدا بخش ضرور شامل ہوتے تھے، جو اس بات پر فخر کرتے نظر آتے کہ آنے والا ان کے قبیلے کا فرد ہے۔ مگر انھوں نے ایسے ملاقاتیوں کے سامنے خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اطراف ایک نوع کی آزادی اور عزتِ نفس کا ہالہ ضرور ہوتا تھا۔ وہ لوگوں سے اسی قسم کے احترام کی توقع بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو اپنی کوتاہ قامتی پر ملال بھی ہو جاتا تھا مگر انھیں اس بنا پر کمتری کا کبھی احساس نہیں ہوا، بس ذرا دلبرداشتہ ہوتے مگر پھر فوراً ہی بحال ہو جاتے۔ میں جس بات کو واضح کرنا چاہ رہا ہوں، اس کی بہترین مثال ایک واقعہ ہے جو ان کے بیٹے نے سنایا۔

''میرے والد پوری زندگی ایک منکسر المزاج انسان رہے، اس وقت بھی جب وہ عوام کی نظروں میں ایک اہم آدمی بن چکے تھے۔ وہ کبھی امیر آدمی نہیں بن سکے اس لیے کہ وہ بہت سے غریب لوگوں کفالت کا بوجھ اٹھائے رہتے تھے۔ وہ بہت فراخ دلی سے ایک اسکول کی امداد کرتے تھے۔ ان میں کوئی عیب نہیں تھا، انھوں نے کبھی سگریٹ تک نہیں پی۔ انھیں ہاکی اور سنیما سے شغل تھا۔ کبھی کبھی وہ نو بجے والا شو دیکھنے جاتے تھے، یا کوئی ہاکی کا میچ دیکھنے۔ انھیں مطالعے کا شوق بھی تھا، مگر انشورنس اور ایکچوری سے متعلق مضامین کی کتب کا۔ وہ بہت محبت کرنے والے باپ تھے، جس کی میں کئی مثالیں پیش کرسکتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ان کے انتقال کی صورت میں ایک بڑے انسان سے محروم ہوگیا ہوں۔ میں جو واقعہ بیان کر چاہ رہا تھا اب وہ سنیے۔ میں نے ڈھاکے میں مسلم کمرشل بینک میں ملازمت کر لی تھی۔ میرا دفتر دور نہیں، بالکل گلی کے نکڑ پر تھا، گلستان سنیما کے قریب۔ دوپہر کا وقت تھا، تقریباً ساڑھے چار بجے کا۔ اچانک وہ میرے دفتر کے دروازے پر کچھ چابیاں لیے کھڑے تھے۔ وہ چابیاں ایک بالکل نئی کار کی تھیں، جو دفتر کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ ان کا پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ انھوں نے مجھے چابیاں دیتے ہوئے کہا، ''بیٹا، یہ میری عزت کی خاطر ہے۔ تم اب اس کار پر دفتر آیا کرو گے۔'' اس واقعے سے زندگی کے بارے میں ان کے اندازِ نظر کا

احساس ہوتا ہے، خلوص، بے غرضی جس سے وہ اپنے پیاروں سے اور قریبی لوگوں سے پیش آتے تھے۔"

۱۹۶۹ء میں ای ایف یو چھوڑ کر اپنی بیمہ کمپنی بنانے کا فیصلہ اس کمپنی کا بڑا نقصان تھا جس کی آبیاری میں ان کا بڑا کردار تھا، جس کو انھوں نے اتنے بڑے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ کوئی دوسری کمپنی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی مگر یہ نئی قوم بنگلہ دیش کے لیے ایک بہت بڑا تحفہ تھا۔ بہت سے لوگ اس بات پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ ای ایف یو کا ایک بڑا باصلاحیت اور اعلیٰ افسر کمپنی کو چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے۔ بازار میں اس سلسلے میں بہت سی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کامیابی کا خناس سما گیا تھا کہ وہ اتنی عظمت اور اتنا عروج ہضم نہیں کر سکے جو ان بیجوں کا نتیجہ تھا جو ان کی زرخیز زمین میں اس درخشندہ ستارے نے بوئے تھے جس کو روشن علی بھیم جی کہتے ہیں، جو پاکستان میں بیمے کی صنعت کے 'ڈین' ہیں۔

ان کے بیٹے، زبید الرحیم کو ان کے والد کے دوستوں نے بتایا تھا کہ خدا بخش اور بھیم جی میں کمپنی کی سرمایہ کاری پر اختلافات ہو گئے تھے۔ ایک قطعۂ زمین کے بارے میں جو انھوں نے ڈھاکے میں کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کی اجازت کے بغیر خرید لیا تھا۔ میں اس بات پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا، نہ ہی میں اس پر کچھ کہنا چاہوں گا۔ بھیم جی مشرقی پاکستان کے لوگوں کے جذبات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ راولپنڈی میں کمپنی کی مجوزہ عمارت مکمل ہوتے ہی ڈھاکے میں ایک نہایت خوب صورت عمارت تعمیر کی جائے گی۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مغربی پاکستان کے مقابلے میں، بھیم جی مشرقی پاکستان کی اہم سیاسی شخصیات سے ہمیشہ زیادہ قریب رہے تھے۔ اس لیے ای ایف یو چھوڑنے کے سلسلے میں اس قسم کی افواہیں اڑانا بھیم جی کے ساتھ انصاف نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہم لوگوں نے یہ سوچا ہو گا کہ جب وہ اس قابل تھے کہ پورے ملک کی تجارتی پالیسی کی رہنمائی کر سکتے تھے تو یقیناً وہ اس قابل رہے ہوں گے کہ خود وہ اپنی کمپنی کیوں نہ چلائیں جس کے وہ مالک و مختار ہوں گے۔

جو بھی وجوہات رہی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۹ء میں فیڈرل لائف اینڈ جنرل انشورنس کمپنی نام کا ایک نیا ادارہ قائم کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ای ایف یو سے 'علیحدگی کے بعد بھی خدا بخش نے کبھی ایسٹرن فیڈرل یونین یا مسٹر بھیم جی کے خلاف ایک لفظ بھی اپنے منھ سے نہیں نکالا۔ وہ برسوں ان کے معترف رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے کہا کہ، "انھوں نے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی، ای ایف یو چھوڑنے کی وجوہات بیان نہیں کیں جس کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ جو کچھ وجوہات میں نے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان باتوں پر مبنی ہیں جو میرے والد کے دوستوں نے مجھ بتائی تھیں، خود انھوں نے نہیں،"

اس نئی کمپنی کا صدر دفتر ڈھاکے میں تھا۔ مشرقی پاکستان کے سات یا آٹھ سربرآوردہ صنعتی اور تجارتی افراد اس کے مددگار تھے۔ اس کمپنی نے بہت جلد کامیابی حاصل کر لی اور صرف پہلے سال کے کاروبار ہی سے حصص یافتگان کو منافع دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

بدقسمتی سے یہ خوش آئند کامیابی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ مشرقی پاکستان کے حالات بگڑنے لگے اور بالآخر بنگلہ دیش بن گیا۔ بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر چار مختلف ادارے بنا دیے گئے، دو لائف انشورنس کے اور دو جنرل انشورنس کے۔ بنگلہ دیش کے بابائے قوم مجیب الرحمٰن، جن سے خدا بخش کی بچپنے سے شناسائی تھی، کہ وہ بھی فرید پور ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ مجیب الرحمٰن نے خدا بخش سے ملک میں بیمے کی صنعت کے مستقبل کے بارے میں مشورے کیے اور ان چار میں سے ایک ادارے کا چیئرمین بنا دیا تھا۔

دو برس بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ادارے بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ اس لیے دو اداروں کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چوں کی خدا بخش سب سے تجربے کار افسر تھے اس لیے وہی لائف کے ادارے 'جیون بیمہ' کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۳؍ مئی ۱۹۷۲ء کا تھا۔ ٹھیک ایک برس بعد، یعنی ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء کو وہ اپنے دفتر میں بیمار ہوئے۔ فوراً ان کو اسپتال داخل کر دیا گیا۔ کچھ دن اسپتال رہ کر ان کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر ۳۰؍ مئی کو انھیں بڑا خطرناک دل کا دورہ پڑا اور اسی روز، صرف باسٹھ برس کی عمر میں وہ انتقال کر گئے۔ اس طرح انھیں اپنی

کارکردگی کے نتائج دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ملک کے اخباروں اور رسائل میں ان کی موت پر لمبے لمبے تعزیت نامے شائع ہوئے۔ ان کو بنگلہ دیش کی مٹی سے پیدا ہونے والے مشہور فرزندوں میں سے ایک گردانا گیا۔ اعزاز کے طور پر ڈھاکا انشورنس انسٹی ٹیوٹ میں ان کی ایک تصویر آویزاں کی گئی ہے۔ لوگ آج بھی ان کو اچھے اور محترم الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے کو اپنے باپ پر بجا طور پر فخر ہے۔ جب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں، حکومت کے ارکان، سرکاری افسران اور کاروباری مالداروں سے، برسبیلِ تذکرہ کہتے ہیں کہ وہ خدا بخش کے بیٹے ہیں تو لوگ اپنی کرسیوں سے اچھل پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد کتنے زبردست آدمی تھی جنھوں نے ملک کی اس وقت بھی خدمت کی تھی جب اس کا ایک قوم کی حیثیت سے وجود نہیں تھا۔ اور لوگ ان کے باپ کے حوالے سے ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا اس جیسی انسانی روح کے لیے اس سے بہتر لوحِ مزار ہو سکتی ہے؟

ایس ایم معین الدین صدر یحییٰ خان سے اعزاز وصول کر رہے ہیں

جناب معین الدین اور ان کی اہلیہ سعودی عرب کے سفیر کے ساتھ

ایس ایم معین الدین، گوہر ایوب کے دفتر میں گندھارا انڈسٹریز کے ساتھ گروپ انشورنس کے معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے، شرافت علی والا جاہی بھی تصویر میں موجود ہیں

ایم جعفری ایک تقریب میں ایس ایم معین الدین کا استقبال کرتے ہوئے

ایس ایم معین الدین

ایک سچا دوست

اس شخصیت کے خاکے کی بھلا کیسے ابتدا کی جائے جس کی بیٹیاں اپنے مرحوم باپ کو اپنی زندگی کا ہیرو سمجھتی ہوں، ایسی شخصیت جو ایک حیرت انگیز یادگار کی طرح آسمان پر محیط ہو، جو اُن کے قول کے مطابق، اپنی بلندیوں سے کبھی نہیں گرا۔ ایسے آدمی نے یقیناً ایک کامیاب گھریلو زندگی گزاری ہوگی۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔

جی ہاں! معین بھائی، جیسا کہ ان کے دوست انھیں کہہ کر پکارتے تھے، ایک حیرت انگیز انسان تھے، جن کی شخصیت تمام تر گرمجوشی، دوست داری، ہوشیاری اور زیرکی کے خمیر سے اُٹھی تھی، ہندوستان کی زمیں نے جس کو پیدا کیا۔ نہ وہ دانشور تھے نہ انھیں عسکری سائنسی تحقیق کا آدمی کہا جاسکتا تھا مگر قدرت نے ان کو مشکل اور ناممکن حالات میں سے بھی بچ نکلنے کی فطرتی صلاحیتوں سے خوب نوازا تھا۔ ان کے نزدیک 'ناممکن' جیسے لفظ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دوستی کے لیے ایک دل چسپ انسان مگر ایسے کہ ان کو اپنا دشمن بنانے پر کوئی تیار نہ ہوگا۔

میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ معین بھائی مجھ سے اور میرے خاندان سے ہمیشہ دوست نوازی کے جذبے سے پیش آئے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ بہت لمحے گزارے تھے۔ ان کی سادگی، فطری جبلّت اور اسی نوع کی دوسری خصوصیتیں جیسے، غیروں کی مدد نقدی سے ہو یا کسی اور طرح، اُن کے امداد کے جذبے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ معین نے ایک باکمال عورت سالماں، جو دس برس کے لگ بھگ ان سے عمر میں کم تھیں، شادی کی تھی۔ جن سے دونوں پیاری پیاری، یاسمین اور پروین پیدا ہوئیں، میرے دوست نے جن کو بڑی محبتوں سے پالا تھا۔ اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر معیار کی انھیں تعلیم دلائی۔ شادی کر کے دھڑکتے دل مگر فخر اور خوشی کے ساتھ اچھے گھرانوں کے حوالے کردیا۔ ان کے دامادوں میں سے ایک وکیل ہے اور دوسرا آنکھوں کے امراض کا ماہر ہے۔ میں اس سنہری اور خوب صورت صبح کو کبھی نہیں بھول سکتا جب ۱۰؍مارچ ۲۰۰۶ء کو ہم، یعنی میں اور میری اہلیہ، ان کے گھر 'وِنڈ کاسل' ملنے گئے تھے۔ میری اہلیہ چند دن قبل ہی کراچی آئی تھیں۔ بڑی بیٹی یاسمین کی انھیں دنوں شادی ہوئی تھی اور معین نے مجھے اور ایک جرمن جوڑے، پروفیسر ہان، جو ایک مشہور جرمن کیمسٹ تھے، اور ان کی اہلیہ کو غیر رسمی دعوت میں بلایا تھا۔ یہ دراصل میرے اور میری اہلیہ کے اعزاز میں ایک قسم کی خوش آمدید کی محفل تھی۔ پروفیسر ہان، پروفیسر سلیم الزماں صدیقی مرحوم کے قریبی ساتھی، اور تین کیمیائی اداروں کے بنیاد گزار تھے، دو عدد ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں قائم کیے گئے تھے۔ پروفیسر ہان اور ان کی آسٹرین بیوی کراچی کی جرمن اسپیکنگ سوسائٹی میں بہت فعال تھے اور اسی سلسلے سے ان سے ہماری ملاقات تھی۔ میں میری اہلیہ اور پاکستان کی کئی اہم شخصیات، مثلاً نیشنل بینک آف پاکستان کے ممتاز حسن، PICIC کے جناب عقیلی، جناب رنگون والا وغیرہ بھی پاکستان جرمن فورم میں کافی فعال تھے۔ یہ بہت فعال سماجی انجمن تھی جو میکلوڈ روڈ سے بہت قریب سِول لائنز میں بنائی گئی ایک عمارت میں تھی اور یہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی کرتا دھرتا بھی تھی۔

ہان خاندان معین الدین کے ساتھ بہادر آباد میں نئے بنگلے میں مقیم تھا۔ ہم لوگ سب خوش وخرم بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک لڑکی نے میری بیوی سے ساڑی پہننے کی فرمائش کرڈالی جو اس کو شادی پر تحفے میں ملی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی میں چھوٹے سے خود بخود ہوجانے والے واقعات اہم ہو جاتے ہیں، اتنے اہم کہ ان کو زندگی بھر بھلایا نہیں جا سکتا، بس انھیں خوشی کے لمحات میں یاد کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی جب ہم ان پیاری پیاری تصویروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خاص بات ہوگئی تھی کہ میری بیوی نے اچانک پاکستان کے ایک خوب صورت لباس کو زیبِ تن کرلیا تھا۔ ایسے ہی موقعوں پر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ معین کے جیسے گھرانوں سے ہماری ملاقات نہ ہوتی تو شاید اس برِصغیر میں ہمارا قیام مشکل ہو جاتا اور یہاں کی اصل روح سے ہم نابلد رہ جاتے۔

معین بھائی بھوپال کے ذرا اوسط سے بڑے درجے کے بہت باعزت گھرانے میں ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ نو بھائی اور تین بہنوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش سے قبل ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی والدہ جنھوں نے تنِ تنہا ان کی پرورش کی، بہت ہمت والی خاتون تھیں۔ ان کے بڑے بھائی بہن سب ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ معین بھائی بہت آسان بچے تھے، کبھی شرارت نہیں کی اور کم عمری ہی سے بہت سنجیدہ اور متوازن تھے۔ ان کے ایک بڑے بھائی ایس ایم مظہر الدین جوان سے عمر میں بارہ برس بڑے تھے، ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور وہی ان کی زندگی کے 'گرو' تھے۔ جب میں معین کے بڑے بھائی سے ملا اُس وقت وہ نیشنل بینک آف پاکستان کے ڈپٹی مینیجنگ ڈائریکٹر تھے جو اس وقت ایک بہت بڑا عہدہ تھا۔ مگر وہ کسی پر کبھی افسرانہ رعب نہیں ڈالتے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح وہ بھی مختصر جثے کے، آہستہ رو مگر بہت گرم اور تیز گردش کرنے والی آنکھوں کے انسان تھے۔ بہت نرم دل تھے اور اپنے چھوٹے بھائی معین کا بہت خیال رکھتے تھے اور شاید انھوں نے ان کی مدد بھی کی ہوگی۔ مگر یہ رشتہ صرف باہمی احترام ہی سے نہیں کچھ لو اور کچھ دو کی سطح پر قائم تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ برادرِ خورد ہی ہمیشہ کچھ لینے کی منزل میں نہیں رہتے ہوں گے۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد معین الدین نواب آف بھوپال کی حکومت میں ملازم ہو گئے اور مختلف محکموں میں کام کرتے رہے جس میں ریاست کی وزارتِ مالیات بھی شامل تھی۔ اپنی کم عمری ہی میں معین صاحب نے، جو اس وقت شاید جونیئر کلرک رہے ہوں گے، اپنے اندر ایسی خصوصیات اور صلاحیتیں پیدا کرلی ہوں گی کہ اس کی بنا پر بہت سنئیر اور بڑے عہدے کے افسران سے ان کی قربتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ معین صاحب میں کچھ خداداد صلاحیتیں اور عملی کیفیات تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ان کے افسران ان کو اپنے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی کہ بس وہی ان کے ہر قسم کے نازک اور مشکل کام کرنے اور مسائل سلجھانے کے قابل تھے۔ ان میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ اپنے افسروں کے وہ اس وقت بھی ممنون اور وفادار رہتے تھے جب کہ سارا کام وہ کرتے تھے مگر نام ان کے افسروں کا ہوتا تھا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ تلوے چاٹنے والے انسانوں جیسے تھے، ہرگز نہیں۔ معین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ وقت آئے گا جب اپنے افسروں کے ساتھ وہ بھی بلندیوں پر ہوں گے، اور یہ بھی کہ صرف ان کے ساتھ رہ کر ہی وہ رفعتوں کے زینے پر قدم رکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اور ان جیسے لوگوں کے لیے ان دنوں یہ بہت مشکل کام تھا۔ اپنی ان ہی خصوصیات اور وفاداریوں کی وجہ سے وہ کے ایف حیدر جیسے افسر سے قریب ہوئے، جو ان دنوں نواب صاحب کی حکومت میں وزیرِ مالیات تھے۔ ان ہی کے حلقۂ دوستاں میں غلام محمد جیسے لوگوں سے ان کی جان پہچان ہوگئی تھی جو ایک مختصر عرصے کے لیے نواب صاحب کی حکومت میں شامل رہے تھے، ایسے کئی اور لوگ بھی تھے، جو بعد میں پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ یہاں شاید یہ کہنا ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ ایسے اہم لوگ جو ان سے واقف تھے، اور وہ بھی ان سب سے واقف ہوگئے تھے، جنھوں نے بہت برس بعد تک، معین الدین کی بہت مدد کی اور ان کو پاکستان میں پیر جمانے میں مدد فراہم کی تھی۔

ایسٹرن فیڈرل انشورنس کے ۱۹۳۲ء میں قیام کے بعد معین صاحب نے کمپنی کی بھوپال شاخ سے جز وقتی ایجنٹ کے طور پر کام کرنے کی خاطر لائسنس حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ اس طرح وہ اپنی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے تھے۔ چوں کہ وہ کافی

لوگوں سے اپنے تعلقات استوار کر چکے تھے، وہ بہت کامیاب ایجنٹ بن گئے حالاں کہ وہ ایک جز وقتی ایجنٹ تھے۔ معین صاحب کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ جناب کے ایف حیدر سے ان کی جگری دوستی ہو چکی تھی، جو بعد میں اس ادارے کے مستقبل پر اثر انداز ہوئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حیدر صاحب ہی کی وجہ سے معین صاحب نے بیمے کا کاروبار شروع کیا تھا۔

آزادی کے بعد معین الدین نے بھوپال چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ ۱۹۴۹ء میں کراچی ہجرت کر گئے جو ای ایف یو کا صدر مقام تھا۔ معین الدین سے میری ملاقات کراچی پہنچنے کے فوراً بعد اس وقت ہوئی تھی جب میں پہلی بار ای ایف یو کے دفتر گیا تھا۔ حیدر صاحب نے ان سے اور دوسرے اعلیٰ افسروں سے میرا تعارف کرایا تھا۔ معین صاحب اس وقت کراچی کے ایجنسی سیکشن کے منیجر تھے۔ انھیں اپنی ملازمت پر فخر تھا جس کی بنا پر انھیں بیمے کی صنعت میں بہت شہرت نصیب ہوئی۔ میں اپنی ملاقات کے لیے خوب تیار ہو کر آیا تھا اس لیے کہ میرے گُرو مسٹر آئیون، ڈپٹی جنرل منیجر مجھے سب کچھ بتا چکے تھے اور مجھے مشورہ دے چکے تھے کہ میں ان سے دوستی کر لوں۔ اور بہت جلد مجھے اس مشورے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔

جناب معین الدین اپنی ذاتی خصوصیتوں اور اچھائیوں کی بنا پر لوگوں کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ وہ ہر فن مولا بھی تھے اور اپنے بھائی کی بدولت جو نیشنل بینک میں بڑے افسر تھے، ملک کے ایک کامیاب سیلز مین بن چکے تھے۔ اتنے کامیاب کہ بالآخر وہ کمپنی کے جنرل بزنس کے جنرل منیجر بن گئے تھے۔

تکنیکی معاملات میں کمپنی کی تمام شاخوں کی دیکھ بھال کمپنی کے صدر دفتر سے کی جاتی تھی۔ دیکھ بھال سے مراد یہ ہے کہ کمپنی میں قبول کیے جانے والے کاروبار کو کمپنی کی 'انڈر رائٹنگ پالیسی'، اصولوں اور موجودہ 'ٹیرف' قوانین کے مطابق ہونا چاہیے۔ بڑے بڑے نقصانات کے معاوضوں پر بھی صدر دفتر کے مشورے ضروری تھے۔ یہ ذمے داری بہت دنوں تک شوارز کے کندھوں پر تھی جن کی جگہ میرا تقرر کیا گیا تھا۔ جب جناب کے ایف حیدر کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور مسٹر بھیم جی نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو میں جنرل ڈپارٹمنٹ کا سربراہ بن گیا۔

ہمارے جو قارئین بیمے کی صنعت کے انتظامی معاملات سے واقف نہ ہوں ان کی اطلاع کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ میں اور معین الدین دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت میں آ گئے تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ میں ان جیسے لوگوں کی کارکردگی پر نظر رکھوں۔ اور بظاہر ان بنیادوں پر تو دیرپا دوستی استوار نہیں کی جا سکتی تھی۔

ہمارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ مختلف عہدوں اور عمر میں فرق کے باوجود، کمپنی کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے، ہماری دوستی بہترین رہی۔ کام کے سلسلے میں ہماری مسابقت سخت تھی۔ ابتدائی مشکلات تھیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم نے متفقہ طور پر خود کچھ خطوط کھینچ رکھے تھے۔ مگر ہم نے ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر ان خطوط کو پار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس صورتِ حال اور اس سے خود آگاہی کچھ اتنی آسان نہ تھی۔ اس لیے کہ ایک سیلز مین اگر فیصلہ کن عہدے پر متمکن ہو تو ہم دونوں کے درمیان تکنیکی، تعیّنِ قیمت اور بزنس کے حصول جیسے معاملات میں نظریاتی اختلاف کے تناؤ کی وجہ سے مشکلات ہوتی تھیں۔ اور جب تکنیکی معاملات کا ماہر غیر ملکی ہو تو اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج کس طرح کے نکل سکتے ہیں۔ مگر ہمارے درمیان ایسا کبھی نہیں، ایک بار بھی نہیں ہوا۔ اس کے لیے جناب روشن علی بھیم جی کو کھل کر سراہنا چاہیے کہ انھوں نے سب کو، روزِ اوّل سے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس قسم کے 'کھیل' میں وہ کبھی حصہ نہیں لیں گے۔ تاہم معین الدین کو بھی داد ملنی چاہیے کہ انھوں نے میرے قریب سے راہ بنانے یا مجھے نظر انداز کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

روزِ اوّل ہی سے ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ مسٹر آئیون کی پیشین گوئی کے مطابق معین نے مجھے اپنے قریب آنے میں آسانی مہیا کی۔ کئی معنوں میں انھوں نے میری مدد بھی کی۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ کا تعین کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اس سلسلے میں ہم نے

اپنی تحقیق کلفٹن کے علاقے تک محدود رکھی، جو ۱۹۶۰ء میں آج کے مقابلے میں بہت مختلف علاقہ تھا۔ ان دنوں یہ علاقہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، کم آبادی، اور زیادہ تر غیر ملکی سفارت خانوں سے آباد جہاں ان کے بیشتر کارکن بھی رہتے تھے۔ وہیں قمر کورٹ نامی عمارت میں مسٹر کے ایف حیدر کا فلیٹ بھی تھا۔ ای ایف یو کی ملازمت کے دوران اِروِن بھی وہیں قیام پذیر تھے اور مسٹر شوارز بھی۔ کلفٹن کا علاقہ وہاں سے شروع ہوتا تھا جہاں سینٹ پیٹرک اسکول ہے۔ ان چھوٹے جزیروں جیسے علاقوں کے کراچی میں اہم شخصیات بھی رہتی تھیں، جن میں جناح صاحب اور نواب بھوپال کی ولی عہد صاحب زادی شہزادی عابدہ سلطان جیسے شخصیات شامل تھیں۔

معین بھائی کی سینٹرل ہوٹل کے مالکان سے اچھی ملاقات تھی۔ ان دنوں میٹروپول اور کراچی جیم خانہ کے درمیاں سینٹرل ہوٹل ایک بڑا کاروباری مرکز تھا۔ اس کی عمارت میں ہوائی سفر کی کمپنیاں اور کئی قسم کے تجارتی اداروں کے دفاتر تھے۔ اب یہ ہوٹل باقی نہیں رہا۔ مگر ۱۹۶۰ء میں یہ کراچی کے چار بڑے ہوٹلوں میں سے تھا۔ تین دوسرے ہوٹل تھے، میٹروپول، بیچ لگژری ،اور پیلس ہوٹل جس کی رات کی رنگینیاں 'Gourmet' میں بہار دکھلاتی تھیں جس میں شہزادی امینہ رقص کرتی تھیں اور اپنا دربار سجاتی تھیں۔ جب کوئی خاص شخصیت یا اہم گاہک آتا تھا تو ہم سب اس میں جایا کرتے تھے۔ یہ ہوٹل کاروباری حضرات اور غیر ملکی مسافروں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ میں تقریباً تین ماہ تک اس ہوٹل میں مقیم رہا تھا، جب تک کہ میری اہلیہ کراچی نہیں پہنچ گئی تھیں۔ اس دوران ،نگہبان کی حیثیت میں، میں پی ای سی ایچ سوسائٹی میں واقع ایک جرمن جوڑے کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جو تقریباً تین ماہ کے لیے جرمنی گیا ہوا تھا۔

سینٹرل ہوٹل میں میرا قیام یادگار رہا، جس پر ایک پوری کتاب تحریر کی جاسکتی ہے جس میں دوسری عالمی جنگ کی اتھل پتھل اور تقسیم کی صورت میں ہندوستان میں آنے والی بڑی تبدیلیوں اور بے شمار لوگوں کے بے گھر ہو کر پاکستان نقلِ مکانی کی تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔

'آرٹی' نامی ایک سفید فام روسی باشندہ ہوٹل کے ڈائننگ روم کا مہتمم تھا۔ وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سوویت فوجوں سے خائف ہو کر روس سے فرار ہو کر چین چلا گیا مگر جب ماؤزے تنگ نے شنگھائی کی طرف پیش قدمی کی تو وہ چین سے فرار ہو کر کراچی آبسا تھا۔ ان دنوں سفارت کار اور اونچی سوسائٹی کے افراد اُبھرتے ہوئے شہر کراچی کو بہت پسند کرتے تھے۔ آرٹی ، دعوتوں اور تقریبات کے خوب صورت انتظام کے لیے بہت مشہور تھا اور یہاں کی اشرافیہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس کو مختلف مچھلیوں کو دھویں میں بسا کر پکانے میں ملکہ حاصل تھا، کراچی کے اُمرا جن کو بہت رغبت سے کھاتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ' آرٹی' نے کراچی میں اپنے حصے کا مصالحہ لگا کر اس کو بین الاقوامی درجہ دینے اور اپنی ایک شناخت حاصل کرنے میں بہت مدد کی تھی' تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

سینٹرل ہوٹل کے دوسرے مستقل قیام کرنے والے لوگوں میں فیلڈ برگ نامی جرمنی کا ایک بزرگ یہودی جوڑا بھی تھا۔ اس کے پاس جرمنی کی تاثری پینٹنگز کا ایک مجموعہ تھا جو وہ اپنے خاص اور نجی دوستوں کو دکھایا کرتا تھا۔ زیادہ تر خاکے بغیر فریم کے تھے جنھیں وہ اپنے چند سوٹ کیس میں اپنے کمرے کی چائنیز الماری کے اوپر رکھتا تھا۔ اس کی بیوی، جو ساٹھ کے پیٹے میں اور خاصی خوب صورت تھی، روزانہ ریڈیو پاکستان سے کلاسیکی مغربی موسیقی کا پروگرام پیش کرتی تھی۔

دوسرے لوگوں میں میرے دفتر کے ساتھی Raoul Dietl بھی تھے جنھیں میونخ ری کی جانب سے ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ میں انتظامی امور کی نئے سرے سے، بین الاقوامی معیار کی، شیرازہ بندی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کی کچھ دن قبل ہی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیوی ایک ماہر پیانو بجانے والی پیشہ ور موسیقار تھیں۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان کے کئی پروگراموں کی ترتیب کے سلسلے میں مسز فیلڈ برگ کی معاونت کی تھی۔ مسٹر کریم اور ان کے بھائی، جو سینٹرل ہوٹل کے مالک تھے، اس بین الاقوامی رنگ سے بہت شاداں تھے اور اپنے مسافر گاہکوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

معین جانتے تھے کہ ان کے پرانے دوست کریم کا کلفٹن میں ایک بہت وسیع اور خوب صورت گھر تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس

میں ایک انیکسی (Annexe) بھی تھی جس میں نہ صرف موٹر گیراج بنے ہوئے تھے بلکہ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی تھا۔ یہ انیکسی کریم صاحب کے ہندوستان سے آنے والے دوست اور عزیز استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھ سے بات کیے بغیر مہربان معین الدین نے کریم صاحب سے دریافت کیا کہ وہ اپنی انیکسی کو ان کے کسی جرمن دوست کو کرائے پر دینے پر رضا مند ہوں گے یا نہیں۔ اور پھر ایک صبح معین صاحب میرے پاس تشریف لائے اور انھوں اپنے چمکتے ہوئے اور مسکراہٹ سے مزیّن دل آویز چہرے کے ساتھ اعلان کیا کہ انھوں نے میرے لیے کلفٹن کے علاقے میں ایک بہت اچھی قیام گاہ ڈھونڈ لی ہے اور اگر ہمیں منظور ہو تو ہم اس میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ یہ جگہ ایک احاطے میں تھی جو ۹۰ کلفٹن سے متصل تھا۔ اسی جگہ میری بیوی جرمنی کے سفارت خانے میں کام بھی کرتی تھی۔ اس سے بہتر ہمارے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہم اپنے دوست کے بہت شکر گزار ہوئے۔

ہمیں ایک ٹیلی فون کی ضرورت تھی جو ان دنوں پاکستان میں نایاب تھا۔ کیسے حاصل کیا جائے؟ معین سے پوچھو، وہ کوئی حل نکالیں گے! اپنی خوش دامن کو کرسمس کے موقعے پر جرمنی ٹرنک کال کرنی ہے؟ معین سے پوچھو، وہ ٹرنک ایکس چینج کے جنرل منیجر کے دوست ہیں، کوئی مسئلہ نہیں! انکم ٹیکس کے دفتر سے آپ کو تین سال بعد ملک سے باہر جانے کی راہداری کس نے دلائی؟ معین صاحب ایک افسر کو ڈھونڈ نے میں کامیاب ہو گئے، وہ دفتر سے ناظم آباد اپنے گھر جا چکا تھا، پسینے میں شرابور، ہانپتے کانپتے، اسے لائے اور دفتر کھلوا کر سرٹیفکیٹ دلوایا ورنہ فلائٹ چھوٹ جاتی! مختصراً یہ تھے ہمارے معین بھائی، ہر فن مولا!

معین صاحب مرحوم کی بڑی بیٹی یاسمین کہتی ہیں، ''وہ اپنے جاننے والوں میں بہت مشہور تھے، اس لیے کہ جو بھی سامنے آیا، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس کی مدد کی۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، بڑے سے بڑے آدمی سے عام انسان تک۔ لوگ ان کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ ان کے اچھے دوست تھے، مشیر بھی اور بہی خواہ بھی۔ وہ بہتوں کے راز داں تھے، انھوں نے کسی کو بھی مایوس نہیں کیا۔ انھوں نے سماج کے ہر حلقے میں اپنا مقام بنایا تھا، صرف اپنے ماحول ہی میں نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ لوگوں کو مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش کی۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے دوست ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ بہت محبت کرنے والے باپ بھی تھے۔ جب بھی میں اور میری بہن کسی مسئلے سے دوچار ہوتے، ہم ان کو اپنا راز دار بنا لیتے۔ انھیں کبھی ہلکا سا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہماری مشکل حل نہیں کر سکیں گے۔ ہم دونوں ان سے بہت قریب تھے اور ان سے راز داری کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخر وقت تک جاری رہا۔ انھوں نے ہمیشہ ہماری رہنمائی کی۔''

معین بھائی گھر کی تینوں خواتین سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، بیوی سالماں، اور دو بیٹیاں۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو، جہاں تک ممکن ہوا، بہترین تعلیم دلوائی ہے۔ جب بھی وہ ملک سے باہر جاتے، اپنے وقت کا لمحہ لمحہ اس میں گزارتے کہ وہ اپنے گھر کی پیاری خواتین کے لیے کیا تحفہ لے جائیں۔ ہم دونوں نے کئی بار ساتھ سفر کیا تھا اس لیے میں جانتا ہوں کہ اپنے گھر والوں کے لیے ان کے احساسات کیا تھے۔ ہم، میاں بیوی بھی، جو تین بیٹوں والے تھے، ان کے، اس قدر مہنگے مشغلے سے متاثر تھے۔ اور ہم جب بھی شہر سے باہر ہوتے تو دن میں کم از کم ایک بار گھر والوں سے فون پر بات ضرور کرتے۔

دوسری بیٹی پروین کہتی ہیں، ''ہندوستانی معیار کے اعتبار سے ہمارا ایک چھوٹا سا خاندان تھا، ماں باپ اور صرف دو بیٹیاں۔ مگر ہمارے والدین اتنی محبت کرنے والے تھے، ہماری پرورش میں اتنی دل چسپی لیتے تھے کہ ہمیں اس بات کا کبھی احساس بھی نہیں ہوا کہ بغیر بھائی کے ہمارا خاندان مکمل نہیں، جیسا کہ عام ہندوستانی خاندانوں میں ہوتا ہے اور ایک طرح کی مایوسی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات کبھی نہیں آئے۔ ہم ایک دوسرے پر بہت ناز کرتے تھے۔ میرے نزدیک ہمارے باپ ایک 'ہیرو' تھے جو اپنے بلند مقام سے کبھی نہیں گرے۔ ہمیں اچھی طرح علم ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہوں گے، اس وقت بھی جب وہ پاکستان سے باہر ہوتے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس ٹیلی فون پر ملیں گے۔ اگر ان کے پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی ہوتی تو وہ ہمیں فوراً مطلع کر دیتے۔ اگر چہ ان کے بغیر

ہم خود کو تنہا محسوس کرتے، مگر چوں کہ وہ ہمیشہ ٹیلی فون پر مل سکتے تھے اس لیے ہمیں اطمینان ہوتا تھا۔"

معین بھائی ہر قسم کے دوست رکھتے تھے، ذاتی بھی اور کاروباری بھی۔ مشہور و معروف شخصیات، جیسے جنرل حبیب اللہ، ایر مارشل نور خاں، صدر ایوب کے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب، جو ایک بڑے کاروباری اور صنعت کار تھے، اکثر ان کے گھر آتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ایسٹرن فیڈرل یونین ایک عظیم ادارہ بن چکی تھی، جس کے افسرانِ اعلیٰ میں ایس ایم معین الدین جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ اس وقت ایک قومی ہیرو بن گئے تھے جب انھوں نے، راولپنڈی کے ریجنل منیجر کی وساطت اور ایگزیکٹو ساجد زاہد کی مدد سے، پوری پاکستانی فوج کا گروپ انشورنس کیا تھا۔ اس گروپ انشورنس کے طفیل کمپنی نے گروپ انشورنس کے ایک بڑے محکمے کی بنیاد رکھ دی تھی، اور بین الاقوامی سطح پر انشورنس کا ایک بڑا ادارہ بن کر ابھری تھی۔

ان کے لیے وہ ایک بڑے فخر کا مقام رہا ہوگا جب پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ نے انشورنس کے میدان میں ان کی ممتاز خدمات پر ان کو اعزاز سے نوازا تھا۔

اٹھائیس برس گزر گئے ہیں جب ہمارے دوست معین الدین نے کراچی کے جناح اسپتال میں اپنے خالق کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ میں اور میری اہلیہ ان کے گھر 'ونڈ کاسل' کے اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ہم اپنے قریبی دوست معین کے ساتھ درجنوں بار بیٹھ چکے تھے، جب ہم کراچی میں مقیم تھے۔ اور وہ سب بھی وہیں تھے، ان کی بیوی سالماں، ان کی دونوں بیٹیاں، دونوں داماد، اور نواسے نواسیاں۔ سب ان سے محبت کے بندھن میں ایک ساتھ بندھے ہوئے!

ان کی بیٹی نے کہا، "سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے لیے ہمارے والد ایک ہیرو کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج میں ایک ممتاز آنکھوں کے سرجن کی بیوی ہوں۔ وہ بین الاقوامی سطح پر جانے اور مانے جاتے ہیں۔ جب میں کسی پارٹی میں جاتی ہوں تو پروفیسر کرمانی کی بیوی کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اور لوگ مجھے ایسے معروف انسان کی اہلیہ ہونے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ اور پھر فوراً کئی مریضوں کے نام لینے لگتے ہیں، میرے شوہر نے جن کی آنکھوں کے آپریشن کیے ہوتے ہیں۔ یقین کیجیے کہ جب میں لوگوں کو بتاتی ہوں کہ میں جناب ایس ایم معین الدین کی بیٹی ہوں تو لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور آج بھی میرے دل میں اپنے والد کے لیے شکر کے جذبات موجزن ہیں۔ اور یہی وراثت ہے جو میرے والد نے اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔ ایک اچھا نام۔ ایک نام ہم جس پر بہت بہت فخر کرتے ہیں۔"

۱۹۶۰ء میں ایچ ڈبلیو شوارز کے اعزاز میں الوداعی تقریب، دائیں جانب کی آخری نشست پر مسٹر شوارز،
اگلی نشست پر ان کے جانشین، مصنف اور حبیب انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر محمد صاحب تشریف فرما ہیں

هائنز شوارز

روشنی کا مینار

اس انسان کے ذکر کے بغیر یہ کتاب کبھی لکھی نہیں جاسکتی تھی۔ کیوں؟ میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا۔

اس کتاب کی جڑیں ۱۲راکتوبر ۱۹۵۱ء تک پہنچتی ہیں، اس دن تک جب ہائنز شوارز ایسٹرن فیڈرل یونین میں افسر بکارِ خاص کی حیثیت سے، نو برس کے لیے، کراچی میں متعین کیے گئے تھے۔ اس وقت یہ ایک طویل سفر تھا۔ اور اگر چہ وہ عالمی جنگ میں چھ سال کے طویل تلخ تجربے سے گزر چکے تھے، ان کے دل و دماغ بھڑکتے ہوئے جذبات سے لبریز اور ذہن اس ادھیڑ بن مین الجھا ہوا تھا اب کہ ان کا ذاتی مستقبل کیسا ہوگا؟ وہ ایک کھنڈر، راکھ کے ڈھیر ملک، بیوی 'گالینا' ماں اور دو بہنوں، سب کو برلن میں چھوڑ کر آرہے تھے۔ برلن کبھی ایک طاقتور ملک کا شان دار دارالحکومت تھا مگر آج وہ جنگ کی فاتح اُن طاقتوں کے درمیان تقسیم تھا جو 'مشرق و مغرب' کے درمیان ایک 'سرد جنگ' میں مصروف تھیں۔

اس انسان کی زندگی کا مجھ سے، یعنی اس کتاب کے مصنف سے، کیا رشتہ ہے؟ اس کتاب کے بیشتر قاری اس سوال کے جواب سے واقف ہوں گے۔ اور جو نہیں جانتے، ان کے لیے ایک مختصر سا جواب یہ ہے کہ میں اس کا جانشین تھا۔ اس ہی کی طرح میں بھی، جذبات سے بھرپور اور توقعات سے لبریز دل و دماغ کے ساتھ اس نوزائیدہ ملک میں صرف نو برس بعد وارد ہوا تھا۔ اس کا اور میرا ملک جرمنی ڈرامائی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ شکستہ در و دیوار گرائے جاچکے تھے، جلے ہوئے نشیمن کی راکھ صاف کی جاچکی تھی، اور ایک نئی قوم دوبارہ ابھر رہی تھی۔ ایک ملک جو، پاکستان کی طرح، امیدوں اور توقعات سے لبریز تھا مگر انسانوں کے خاندان میں اپنا مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دنیا کے پاس اسے دینے کے لیے کیا تھا، جب کہ وہ، نو برس کے عرصے کے بعد، اپنی نسل کے دوسرے لوگوں کی طرح، جو جنگ کی ہولناکیوں سے بچ گئے تھے، خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ ایک معذور ملک پھر کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکے گا۔

اب، نو برس بعد، واپسی پر وہ ایک ایسی قوم اور اس کے افراد کے سامنے کھڑا ہوگا جو اس کے لیے اجنبی ہوں گے۔ مسز آئیون، بیوی، بیٹی اور تحسین احمد ہوائی اڈّے پر اس کے منتظر ہوں گے۔ مسٹر شوارز کے قیام کا انتظام تاج ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ جہاں ان کا قیام ان کی اہلیہ کی آمد تک رہنا تھا جو اگلے برس، یعنی ۱۹۵۲ء میں آنے والی تھیں۔

اس زمانے میں کراچی بالکل ہی مختلف شہر تھا۔ اس کا رقبہ بہت کم اور آبادی پندرہ لاکھ تھی، جب کہ آزادی سے پہلے یہاں صرف چار لاکھ افراد بستے تھے۔

پاکستان کا دارالحکومت بنائے جانے کے بعد صرف چار برس کے عرصے میں اس شہر میں ڈرامائی تبدیلیاں ہوگئیں تھیں۔ ۱۹۴۸ء

سے قبل کراچی جنوبی ایشیا کا بہترین انداز میں رکھا گیا شہر مشہور تھا۔ اس میں جتنی تبدیلیاں ان چند برسوں میں ہوئیں تھیں، شاید دنیا کا کوئی شہر ان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ آج اس کی آبادی کا تخمینہ ایک کروڑ لگایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے تخمینے کے مطابق ۲۰۱۵ء تک اس کا شمار دنیا کے دو کروڑ آبادی والے پانچ بڑے شہروں میں ہوگا۔ اس طول و عرض کی ترقی، ترقی ہوتے ہوئے بھی خوف ناک لگتی ہے۔ اسی طرح جیسے کہ اس کے اصل باسیوں کو، تقسیم ہند کے بعد، اس وقت لگی ہوگی جب لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین پناہ کے طالب ان کے دروازوں پر کھڑے رہے ہوں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے کراچی مواقع فراہم کرنے والا شہر رہا ہے۔ بہت سے آنے والوں نے اس شہر سے اگر کچھ حاصل کیا ہے تو اس کو کچھ دیا بھی ہے، جذبے، بلند عزائم، تجارتی اور صنعتی عزائم وغیرہ جن پر اس بڑے شہر، اور اس ملک کے صنعتی اور مالیاتی مرکز کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔

مسٹر شوارز کو اس شہر میں قیام کی کوشش میں وہی دشواریاں پیش آئی ہوں گی جیسی کہ ابتدائی دنوں میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں سونے کی تلاش میں آنے والوں کے سامنے تھیں۔ وہ لوگ بھی تو امکانات کی نئی سرزمین پر نئی جنّت کی تلاش میں جوق در جوق آئے تھے۔ ہجرت کر کے کراچی آنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ آدمجی، داؤد اور رنگون والا، جیسے پیش قدم صنعتکار، تجار اور نت نئے اداروں کی بنیاد رکھنے والوں نے اپنے کارخانے قائم کیے۔ اپنے حبیب، اصفہانی وغیرہم نے اپنے بینکوں، بڑی بڑی انشورنس کمپنیوں کے دفاتر بمبئی، کلکتے سے کراچی منتقل کیے۔ بے شک ان میں مقامی اور غیر ملکی قسمت آزمائی کرنے والے بھی رہے ہوں گے جن کے ارادے پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گویا کراچی، خصوصاً اس زمانے میں، ایک ایسی بھٹی کے مماثل تھا جس میں کود کر ہر قسم، ہر رنگ، ہر نسل، ہر تہذیب، ہر مذہب اور ہر انداز کے لوگ ایک نئی دنیا ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہوٹلوں میں کمرے مشکل سے ملتے تھے۔ اور شوارز جیسی قسمت کے لوگوں کو کمروں کی جگہ صرف ایک بستر مل جایا کرتا تھا۔ شوارز کو ایک چھوٹے سے کمرے میں، ایک ہندوستانی سفارت کار کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ ہندوستانی سفارت پیرس میں رہ کر کچھ فرانسیسی سیکھ چکا تھا۔ شوارز کو فرانسیسی زبان آتی تھی۔ تو ان کے درمیان تبادلے کا ایک معاہدہ سا ہوگیا تھا۔ شوارز سفارت کار کو فرانسیسی سکھاتا تھا تو سفارت کار شوارز کی انگریزی درست کرتا تھا۔ اس طرح دونوں کو سہولت بھی ہوگئی تھی۔ صفائی کا معیار بہت خراب تھا، بس بنیادی درجے کی جھاڑ پونچھ ممکن تھی۔ مگر کراچی کے رنگ بھرے ماحول اور بازار نئے آنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ شوارز ای ایف یو کے صدر دفتر، قمر ہاؤس، میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہت پُر امید تھا۔

شوارز کا افسر، آئیون جرمن بھی تھا اور اس ملازمت سے قبل اَلیانز انشورنس کمپنی میں کام بھی کر چکا تھا اس لیے ان دونوں میں جلد ہی دوستی ہوگئی۔ شہر میں جرمن سفارت کار بھی مقیم تھے۔ کمپنی کے بڑے حصے دار اصفہانی خاندان سے بھی شوارز کی دوستی بڑھی، جو جنگ اور آزادی کے بعد سے، آئیون جیسے تجربے کار غیر ملکیوں کو اس ملک میں لانے میں آگے آگے تھے۔ شوارز ایک اچھا اضافہ تھا۔

شوارز اور آئیون دونوں اَلیانز انشورنش کے فارن ڈیپارٹمنٹ کے دنوں کے ساتھی تھے۔ یہ محکمہ اس لیے بند کردیا گیا تھا کہ جنگ کی فاتح طاقتوں نے ایک حکم کے ذریعے اَلیانز اور دوسری بیمہ کمپنیوں پر غیر ملک میں جرمنوں کو تعینات کرنے پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ شوارز جنگ سے قبل ہی سے جرمنی کی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا اور جنگ کے اختتام کے وقت وہ فرسٹ لفٹیننٹ تھا۔ میدانِ جنگ سے واپسی پر اس نے انجینئر بننے کے لیے برلن میں سِول انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات آئیون سے ہوئی تھی جو خود بھی انجینئر تھا۔

شوارز برلن کے متوسط طبقے کے ایک جرمن گھرانے میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ اسی شہر میں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔ پرانی اور نئی صدیوں کے سنگم پر عام لوگوں کی طرح شوارز کے باپ کا بھی کسان خاندان سے تعلق تھا۔ وہ پہلی عالمی جنگ کے دوران شاہی فوج کے چیف آف اسٹاف کا خدمت گزار رہ چکا تھا۔ کئی برس تک اس نے جرمنی کے ایک شہزادے کی بھی خدمت گزاری کی تھی۔ اس کا خاندان

Hanseatic شہر ہیمبرگ کے Rupertis کا تھا اور اس کی نہایت خوب صورت اور خراج ماں کا تعلق بلجیم سے تھا جس کے گھر والے برلن میں بس گئے تھے اور شوارز خاندان سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ برلن میں بس گئے تھے اور شوارز خاندان کی زندگیوں میں بہت کام آئے۔ انھوں نے اس کے والد کو جرمنی کے مشہور ڈپارٹمینٹل اسٹور Wertheimer میں ملازمت دلا دی جو بیسویں صدی کے اوائل میں ایک کارِ مشکل تھا اور مسز روپرٹی نے نوجوان شوارز کو نہ صرف اپنی مادری زبان، فرانسیسی میں ماہر بنا دیا تھا بلکہ اس کو جرمنی کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی اَلیانز میں زیرِ تربیت افسر کی حیثیت سے بھرتی کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کا بیٹا Dr Ernst Justus Ruperti ان دنوں کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں تھا اور غیر ملکی کاروبار کا ذمے دار تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسٹر اروِن سی آئیون، جن کا پہلے ذکر آچکا ہے، بنکاک میں ایک جرمن تجارتی کمپنی میں کچھ دن کام کرنے کے بعد اَلیانز کے رنگون میں نمائندے بنا دیے گئے تھے۔ اروِن اور ہائنز دونوں کشتی رانی کے بہت شوقین تھے اور دونوں کمپنی کے بوٹ کلب میں ملاقاتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے واقف ہو گئے تھے۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے ۱۹۳۶ء میں علیٰحدہ ہو گئے اس لیے کہ اروِن کو تربیت کے سلسلے میں بمبئی بھیج دیا گیا تھا۔ تین برس کی تربیت کے بعد مسٹر شوارز نے کامیابی سے برلن چیمبر آف ٹریڈ اینڈ کامرس کے امتحانات پاس کر لیے اور کمپنی کے غیر ملکی کاروبار کے ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں رضا کارانہ طور پر جرمن فوج میں کیڈٹ بننے کی پیش کش کردی۔ اسے اس کا گمان تک نہ تھا کہ ان کی یہ ذمے داری آٹھ برس کے طویل عرصے تک چلے گی۔ اسے اس بات کی بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اس وقت کی فاتح فوجوں کے ساتھ فرانس جا پہنچے گا جہاں فرانسیسی زبان میں اس کی مہارت اس کے اعلیٰ افسروں کی نظروں میں اس کا وقار بلند کردے گی۔ جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، روسی علاقوں پر چڑھائی کے سلسلے میں جرمن فوجوں کی مہم ناکام ہوئی، اسٹالن گراڈ جرمن فوجوں کی شکست کی علامت بن گیا اور Third Reich مکمل تباہی سے دوچار ہوئی۔ ہائنز شوارز کے لیے روسی علاقوں میں داخل ہو جانے کے عمل سے اس مستقبل کی زندگی پر بہت گہرا اور فیصلہ کن اثر پڑا۔ اپنی بیوی گالینا سے اس کی ملاقات ہوئی جو روسی سمفنی آرکسٹرا کے کنڈکٹر کی بیٹی تھی۔ گالینا کا باپ آسٹریا سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے ایک روسی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے گالینا پیدا ہوئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں آرکسٹرا کنڈکٹر کو، کسی جرم، کسی الزام یا کسی مقدمے کے بغیر روسی فوجوں کے جاسوس محکمے نے قید کرلیا، اور پھر وہ کبھی، زندہ یا مُردہ کہیں نہیں دیکھا گیا۔ بس وہ غائب کر دیا گیا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے اسٹالن کے دورِ اقتدار میں روس کے ہزاروں، لاکھوں تعلیم یافتہ افراد روئے زمیں سے غائب کر دیے گئے تھے۔ اور یہ بار بار ہوتا رہا تھا۔ سوویت اقتدار کے ظلم کا نشانہ گالینا اور اس کی ماں کا روسی علاقوں پر قابض جرمن فوجوں نے خاص خیال رکھا اور گالینا نے ان کے لیے ترجمانی کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیے، حالاں کہ وہ اعلیٰ درجے کی موسیقار بھی تھی، اور باقاعدہ موسیقی کے اسکول سے پیانو بجانے کی تربیت بھی حاصل کر چکی تھی۔ جب جرمن قابض فوجوں کو پسپا ہونا پڑا تو ہائنز شوارز نے دونوں کو اپنی بیوہ ماں اور دو بہنوں کے پاس برلن بھیج دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد شوارز اور گالینا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

ہائنز شوارز ایک 'فریب خوردہ نسل' سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے کی حیثیت میں اس نے ایک شکست خوردہ قوم پر پڑنے والے خوف ناک اثرات کو دیکھا تھا، ایک پھلتی پھولتی اور صحت مند معیشت کے زوال کا مشاہدہ کیا تھا اور اسے ایسے خوف ناک افراطِ زر کا تجربہ ہوا تھا جیسا صنعتی دنیا کی نظر سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ اس نے آسمان کو چھوتی ہوئی بے روزگاری، چور بازار معیشت کا ظہور، اور ہر لمحہ بڑھتے ہوئے جرائم کا وہ حال دیکھا تھا جس نے ہٹلر کی سیاسی جماعت NSDAP اور Third Reich کو جرمنی میں اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان کر دیا تھا۔

اگرچہ شوارز خود کسی سیاسی جماعت کا رُکن نہیں تھا مگر اپنی نسل کی اکثریت کی طرح اس بات پر اس کا بھی ایقان تھا کہ نئے حاکم ایڈولف ہٹلر کی اقتدار پر موجودگی میں اس کے ملک کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اپنے ہم عصر سیکڑوں لوگوں کی طرح وہ بھی 'فیوہرر' کا

پیروکار تھا۔ اس کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ ہم لوگ اپنے بڑے دشمنوں سے جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ حق کے لیے ہے۔ وہ دوسرے صف آرا لوگوں کی طرح یہ نہیں سوچتا تھا کہ جرمنوں کو ان کا رہنما اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کے تحفظ کے لیے توپوں کا ایندھن بنا رہا تھا تا کہ اپنی قوم اور اس کی معاشی برتری کے لیے فتح حاصل کی جا سکے۔ اس کی نسل نے اپنی عمر کا بہترین حصہ، اس بات پر غور کیے بغیر کہ سرحدوں کے پار کیا ہو رہا ہے، خندقوں اور مورچوں میں ضائع کر دیا تھا۔ اور جب جنگ ختم ہوئی اور غبار صاف ہوا تو ان کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا جس پر وہ فخر کر سکتے۔ ان کے زیادہ تر دوست اور اسکول کے ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے یا پھر سائبیریا میں جنگی قیدی بنا لیے گئے تھے۔ جو اس ذلت سے بچ گئے تھے، ان میں بہت سے جسمانی یا ذہنی طور پر معذور ہو چکے تھے۔ اور جہاں تک میری نسل، یعنی دس سے پندرہ برس کے افراد کا سوال تھا، تو وہ بھی یک گونہ مایوسی کا شکار تھے، بھٹکے ہوئے تھے۔ اور جن لوگوں نے جنگی محاذوں پر اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں ان کو بھی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا اور نہ اُن میں یہ ہمت رہ گئی تھی کہ وہ اخلاقی اور دانشوارانہ طور پر خود کو نئی راہوں پر ڈال سکیں۔

اکثریت کی طرح شوارز نے بھی سب کچھ پیچھے چھوڑ کر گزرے ہوئے پندرہ برسوں کو بھلا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کے استعمال سے نئے تقاضوں کو قبول کر لیا تھا اور نئے جذبے کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے ای ایف یو کے کارکن اس کو اسی طرح پسند کرتے تھے جیسے کہ انشورنس اور انشورنس کے حلقے کے باہر کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ بہت نرم خو، نرم کلام اور گرم جوشی کا حامل انسان تھا اور اپنے ساتھی کارکنوں کی بھلائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کو اپنے ساتھیوں کو منتقل کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا تھا۔

وہ فطری طور پر شرمیلا آدمی تھا۔ اس نے کبھی ایسا کام کرنے کی بڑ نہیں ہانکی جو اس کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایسی تمام کوششوں کو رد کر دیتا تھا جس کے ذریعے لوگ یا تو اس کو استعمال کرنا چاہتے تھے یا اس کی انا کو ابھارنا چاہتے تھے۔ وہ ایک منکسر المزاج انسان تھا، بہت صاف گو تھا، اور جب ضرورت ہو تو ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں پر تنقید کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔

اپنی اہلیہ کی آمد کے بعد وہ دونوں کراچی کی سماجی زندگی کا حصہ بن گئے تھے جو ان دنوں خاصی رنگین تھی اور دانشورانہ اعتبار سے بھی کافی پُرکشش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کراچی نہ صرف یہ کہ تجارتی مصروفیات کا محور تھا بلکہ ملک کی سیاست کا مرکز بھی تھا۔ تمام سفارت خانوں، بین الاقوامی اداروں کی موجودگی میں یہاں کی تہذیبی زندگی بہت فعال تھی اور تقریباً ہر ملک کی یہی کوشش تھی کہ اس ملک کو اس کے فنون اور اس کی تہذیب سے متعارف کرایا جائے۔ حقیقی معنوں میں کراچی ان دنوں ایک بین الاقوامی شہر تھا اور اس میں دنیا کی شبانہ رنگینیوں کی بھی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی۔ جیسا کہ میں انھیں صفحات میں ذکر کر چکا ہوں، پیلس ہوٹل میں 'le gourmet' نام کا ایک ریستوران تھا جہاں مشہور بیلی ڈانسر شہزادی امینہ، ڈنر کے بعد رقص پیش کیا کرتی تھیں۔

مسز شوارز ایک اچھی موسیقار اور اعلیٰ درجے کی پیانو بجانے والی تھی۔ اپنے فن کی وجہ سے وہ سفارتی، اور دوسرے مقتدر حلقوں میں بھی اپنے شوہر کے سماجی تعارف کا باعث ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے گرد ایک دل چسپ حلقۂ دوستاں بنا لیا تھا۔ ان میں کئی نام نہاد سفید فام روسی مہاجر' بھی شامل تھے جو کراچی میں میری اہلیہ کی آمد تک موجود تھے۔ کراچی جیم خانہ اور میٹروپول ہوٹل سے متصل سنٹرل ہوٹل کے مسٹر ڑرتی' ان میں سے ایک تھے، ان صفحات میں جن کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی تیار کردہ مچھلیوں کی بہت مانگ تھی، جنھیں شہر کے متمول لوگ اپنے دوستوں کی تواضع کے لیے اپنے ڈرائیور بھیج کر ہوٹل سے منگا لیا کرتے تھے۔ پروفیسر سہروردی، معروف بنگالی سیاست داں اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم کے بھائی بھی تھے جو ماسکو میں بالشویک رقاص حلقے کے ساتھ وقت گزار چکے تھے، وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے آئے تھے اور حتی المقدور ان کی امداد بھی کی تھی۔

میں ایسے بے شمار ناموں کی فہرست پیش کر سکتا ہوں جن سے شوارز خاندان اس شہر میں اپنے طویل قیام کے دوران واقف ہو گیا

تھا۔ شوارز اپنے دس سالہ قیام کے دوران بہت سے قابلِ احترام افراد سے قریب ہوگیا تھا، ایسے بھی جن کا نام کمپنی کے لیے احترام کا باعث بھی ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مسٹر کے ایف حیدر اور مسٹر ای سی آئیون کے ساتھ مل کر شوارز نے سماجی حلقوں میں بھی کمپنی کے وقار میں اضافہ کیا تھا۔ اور جب آئیون اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے میونخ چلے گئے تھے تو اس ادارے میں ان کی کچھ ذمے داریاں مسٹر شوارز کو سونپ دی گئی تھیں۔

اپنے اندازِ زندگی اور کمپنی کے لیے کیے جانے والے کام کو وہ دونوں (آئیون اور شوارز) جتنا پسند کرتے تھے اتنے ہی معترف ادارے کے چیف ایگزیکٹیو اور بورڈ کے ارکان بھی تھے۔ مگر انھوں نے اس بات کو کبھی نہیں بھلایا تھا کہ اس ملک میں ان کا قیام عارضی تھا۔ مسٹر شوارز نے بہت احتیاط کے ساتھ میونخ ری کے اہم اور سینئر افراد سے اپنے قریبی تعلق برقرار رکھے تھے۔ یہ کام اس لیے اور بھی آسان ہوگیا تھا کہ ان کے پرانے مربّی میونخ ری کے ڈائریکٹر ہوگئے تھے اور کمپنی کے ایشیائی کاروبار کی نگرانی ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ قصہ مختصر میونخ۔ری نے مسٹر شوارز سے اس شرط پر اپنے ادارے کے ایشیائی کاروبار میں ملازمت کا وعدہ کیا کہ وہ ایسٹرن فیڈرل یونین میں اپنی جگہ لینے کے لیے کوئی آدمی تیار کرلیں۔ اس طرح میں اس منظر میں داخل ہوا تھا۔

جنوری ۱۹۶۰ء سے ہم دونوں کو اس طرح ایک ساتھ کام کرنا تھا کہ میں ان کی جگہ پُر کرسکوں۔ اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں ان کے برابر ہی کی میز پر کام کرتا تھا۔ صبح سے شام تک ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے اور وہ مجھے کمپنی کی انتظامیہ میں اپنے دس سالہ تجربے کا نچوڑ منتقل کر رہے تھے۔ جس دن کے ایف حیدر نے PIC میں عہدہ سنبھالنے کے لیے کمپنی کو خیر باد کہا، میں کراچی پہنچ چکا تھا۔ مسٹر شوارز نے اس وقت میری آبرو رکھ لی جب، ادارے کی انتظامیہ کے سینئر ارکان بھی موقعے کی نزاکت سے بھرپور ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے۔ ان کی مدد کے بغیر مجھ جیسے نو وارد کا اس جد و جہد سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔ یہ ان ہی کی مدد تھی جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ میں محفوظ رہا بلکہ کافی مضبوط حیثیت میں آ گیا تھا۔

جب وہ ۱۹۶۰ء میں گرمی کے موسم میں جرمنی واپس گئے تو انھوں نے اپنے پیچھے کام کرتا ہوا ایک مستعد اور مضبوط دفتر چھوڑا تھا، ہر اعتبار سے جو ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کا صدر مقام تھا۔ کمپنی کے ملازمین ان کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے کہ جہاں تک ممکن ہوتا وہ سب کی مدد کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی ذاتی کوششوں سے کمپنی کو مہیا کرنے والے کاروبار پر جو کمیشن حاصل کرسکتے تھے اس کو ایک فنڈ میں ڈال دیا جاتا تھا جو انھوں نے تشکیل دیا تھا۔ اس فنڈ میں جمع ہونے والی رقم صرف ضرورت مند کارکنوں کی امداد میں صرف کی جاتی تھی۔ اور ان دنوں ایسے بہت سے لوگ ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح 'ناقص کھاتا نویسی' کی وجہ سے، فنڈ کی رقم کا کچھ حصہ ضائع بھی ہوسکتا ہے، اپنے ایک نائب کو اس فنڈ کا متولّی مقرر کر دیا تھا۔

ان کو انشورنس کے تکنیکی معاملات میں کمال حاصل تھا، کمپنی سے باہر کے حلقوں میں بھی جس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ انشورنس ایسو سی ایشن آف پاکستان کی فائر ٹیکنیکل کمیٹی کے ایک سنیئر رُکن کی حیثیت میں بیمے کے بارے میں ان کے علم اور مہارت کی قدر کی جاتی تھی۔ بیمے کے کام سے الگ، لوگوں نے مقامی زبان، اردو سیکھنے کے سلسلے میں ان کی سنجیدہ کوشش کی بھی ستائش کی تھی۔

مسٹر شوارز نے ای ایف یو کو ایک خالص دوست کی حیثیت میں چھوڑا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ایک برس بعد جب کمپنی کے نئے چیف ایگزیکٹیو روشن علی بھیم جی اپنی کمپنی کو کاروباری نقصان کے طوفان سے نکالنے کی غرض سے امداد کی طلب میں جرمنی پہنچے تو مسٹر شوارز اور ان کے پیش رو مسٹر آئیون دونوں میونخ ری کے ڈائریکٹر تھے اور یہ انھی کا فیض تھا کہ بھیم جی کو خاطر خواہ مدد دی گئی تھی۔

مسٹر شوارز میونخ ری کے ایشیائی کاروبار کے نگراں کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ہم دونوں ایک بار پھر ساتھی ہوگئے تھے، جب میں 'اپنی' ای ایف یو سے فارغ ہو کر اپنے ادارے، میونخ ری میں واپس پہنچا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں اپنے ریٹائر منٹ تک وہ ایران،

ندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور دوسری جنوبی ایشیائی مارکیٹوں کے نگراں تھے۔ وہ ہمارے گھر سے، جہاں ہم لوگ ریٹائرمنٹ کے ند رہتے ہیں، صرف آدھ گھنٹے کے فاصلے پر ایمری جھیل کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کی اکثر اقاتیں ہوتی ہیں، ایک دوسرے کو پوسٹ کارڈ بھیجتے ہیں، اور کچھ ٹیلی فون پر بھی گپ شپ کر لیتے ہیں۔ مزاج میں ہم دونوں بہت مختلف ہیں ور اکثر مسائل پر ہم دونوں میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ مگر ہم دوسروں کے سامنے ایسا نہیں کرتے۔ میرے خیال میں دونوں اس بات سے نفاق کرتے ہیں کہ ہم، اپنے مشترکہ پلیٹ فارم پر، جس میں پاکستان کسی طرح کم درجے پر نہیں ہوتا، ایک دوسرے کے سچے دوست بن چکے یں، ہمارے رشتے معتبر ہیں، ہم ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں اور بھروسے کے قابل ہیں۔ میں گاہے گاہے ان سے بات چیت کا طف اٹھاتا رہتا ہوں اور میری دعا ہے کہ ہم اسی طرح ایک طویل عرصہ گزارنے کے قابل رہیں۔

اپنی طویل رفاقت کے دوران ہائنز شوراز مجھے روشنی کے راہ نما مینار میں بیٹھے، اس احتیاط سے کام کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے بھیجے ہوئے اشارے ان ملاحوں تک پہنچ جائیں جو بہت دور ہوتے ہوئے بھی اپنی کشتی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ وران کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی کوششیں رائگاں نہ ہوں۔ انھوں نے کبھی صلے کی پروانہیں کی ہے مگر یہ امید ضرور کی ہے کہ لوگ کم از لم ان کے کام کا اعتراف کریں۔

اور میں اُن بہت سے لوگوں سے واقف ہیں جنھوں نے اعتراف کیا ہے۔

میاں سعید احمد (اندازاً ۱۹۵۵ء)

میاں سعید احمد

ایک لاہوری سلسلہ

''ہم اس وقت ایلپس کے پہاڑی سلسلے پر پرواز کر رہے تھے جب لفت ہانسا (Lufthansa) کے جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی باویریا (Bavaria) صوبے کے دارالحکومت میونخ کے ہوائی اڈے پر اترنے کے لیے جہاز کو نیچے اتارنا شروع کرنے والا ہے۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، باویریا وفاقی جرمنی کی ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اگر چہ مجھے اس شہر کی تاریخ کا کوئی علم نہیں تھا، پھر بھی ایسا لگ رہا تھا گویا کالج کے دنوں ہی سے اس کی یادیں میری ہم سفر رہی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تربیت کے لیے میرے والد ایک بڑی جرمن کمپنی میں بھیجے گئے تھے۔ یہ بات مجھے اور میرے بھائی کو بتائی گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر میرے والد اس ملک اور وہاں کے لوگوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ جب بھی وہ اچھے موڈ میں ہوتے تو وہاں کھینچی گئی تصویریں نکال کر دکھاتے۔ ان تصویروں میں ان کے کالج کے ساتھی ساجد زاہد بھی نظر آتے جو والد کے ساتھ گئے تھے۔ ساجد زاہد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مشہور گورنر زاہد حسین کے فرزند تھے۔ تصویروں میں وہ دونوں ایک جرمن خاندان کے درمیان تھے، جو خاصا دوست دار دکھائی دیتا تھا۔ اور جب بھی میرے والد اس وقت کی باتیں کرتے تو ان کی آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں اور وہ بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔ یہ تقریباً چالیس برس قبل کا واقعہ ہے۔ اور آج صبح ایلپس کے پہاڑی سلسلے کے اوپر سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا گویا میرے برابر والی خالی نشست پر میرے والد بیٹھے ہوئے کھڑکی سے نیچے جھانک رہے ہیں اور بڑے جذباتی اور بلند آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں 'دیکھو شوکت، یہ جرمنی ہے، مجھے بہت خوشی ہے کہ تم بھی یہاں پہنچ گئے ہو'اور میں نے اس لمحے ان کو خود سے بہت قریب محسوس کیا۔ یہ سب کچھ کتنا اصلی معلوم ہو رہا تھا۔''

یہ سب کچھ میاں سعید احمد کے پہلے بیٹے شوکت سعید احمد کہہ رہے تھے جن کو میں ایئر پورٹ سے لے کر Tutzig میں واقع اپنے گھر لیے جا رہا تھا۔ یہ کار کا سفر ایک گھنٹے کا تھا۔ ہماری گاڑی 'آٹوبان' پر فرّاٹے بھری تھی اور موسم کے معاملے میں ہم خوش قسمت تھے۔ سورج چمک رہا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے باویریا کے ایلپس کا خوب صورت منظر تھا۔ میں شوکت کو بتا رہا تھا کہ صرف پچیس کلومیٹر آگے مرناؤ (Murnau) نامی چھوٹا سے شہر تھا جس میں اس کے والد اور ساجد زاہد، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں جرمن زبان سیکھنے کی غرض سے چند ماہ مقیم رہے تھے۔ شوکت بار بار جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا کہ وہ کتنا خوش ہے کہ اس علاقے کو آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جسے چالیس برس قبل اس کے والد کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس موقعے کا بڑی شدت اور جذباتی انداز سے منتظر رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کاش، ایسٹرن فیڈرل یونین کے ابتدائی دنوں کے میرے ساتھی، اس کے والد اس موقعے کو دیکھنے کے لیے موجود ہوتے۔ انھیں یقیناً اپنے بیٹے پر بہت ناز ہوتا اور وہ مجھ سے ملتے ہوئے پنجابی خاندانوں کی روایتی تہذیب اور مخصوص محبت کے رشتوں کا مظاہرہ کرتے۔ انھوں نے ایسا بارہا کیا تھا اور جب وہ اس کی ابتدا کرتے تو اس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا، اور یہ ان کے محبوب مشاغل میں سے ایک تھا۔

انھیں نے مجھے بتایا تھا کہ پنجابی تہذیب میں خاندانی رشتے اور دوستیوں کی نگہداشت، جسے وہ 'لاہوری کنکشن' کہتے تھے، کتنے اہم ہوتے ہیں۔ اور یہ تأثر جغرافیائی اعتبار سے صرف لاہور والوں ہی کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ یہ ان کے اپنے اندازِ زندگی اور فلسفے کا نام تھا۔

میاں سعید ۱۹۱۹ء میں لاہور کے ایک متوسط درجے کے پکّے پنجابی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ریلوے کے محکمے میں سینئر کلرک تھے۔ انھوں نے جلد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور زراعت شروع کردی تھی۔ اس زراعتی زمین کا ایک حصہ آج بھی ان کے خاندان کے تصرّف میں ہے۔ میاں سعید کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے تھے مگر تنہائی کے سبب ایک برس بعد ہی اپنے مولد لاہور واپس آگئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسلامیہ کالج ان دنوں لاہور کے اہم کالجوں میں سے ایک تھا۔ انھوں نے وہیں سے 'بیچلر آف آرٹس' کی سند حاصل کی۔ یہ اندازاً ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ کی بات رہی ہوگی اس لیے کہ انھوں نے ہمیشہ اصرار کیا تھا کہ ایسٹرن فیڈرل یونین، کلکتے، میں ان کی ملازمت اسی برس شروع ہوئی تھی۔ حالاں کہ یہ ان کی پہلی ملازمت نہیں تھی اس لیے کہ گریجویشن کے فوراً بعد انھوں نے حکومتِ پنجاب کے 'راشننگ ڈپارٹمنٹ' میں کلرک کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی تھی۔ میرے ان قارئین کی اطلاع کے لیے جنھوں نے ایسا نام کبھی نہیں سنا، یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۹۳۹ء میں شروع ہونے والی دوسری عالمی جنگ میں، جو جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف لڑی جارہی تھی، برطانوی ہندوستان ایک اتحادی تھا۔ جنگ کے نتیجے میں تمام متاثرہ ممالک نے ایک 'راشننگ سسٹم' نافذ کیا تھا تاکہ عوام کو اشیائے خورونوش کی فراہمی کا تحفظ کیا جاسکے اور چور بازاری کو جہاں تک ممکن ہو کم کیا جاسکے۔ میاں سعید کو یہ ملازمت بھائی نہیں اور جیسا کہ ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا ان کے والد کے ایک دوست میاں بشیر نے، جو اصفہانی خاندان کے بہت قریب تھے، اور پنجاب میں ای ایف یو کے نمائندے تھے، ان کی ملاقات مرزا احمد اصفہانی سے کرادی تھی۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب سیاست داں اور مسلم لیگی عبدالرحمٰن صدیقی کمپنی کے چیئرمین تھے اور ریاست بھوپال کے وزیرِ خزانہ خوندکر فضلِ حیدر کمپنی کے بورڈ میں ڈائیریکٹر تھے۔ ای ایف یو کی ایک شاخ اسی عمارت میں تھی جس میں آج کل، موجودہ زونل منیجر کا دفتر واقع ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ شاہراہِ قائدِ اعظم پر واقع یہ عمارت آج کل کو آپریٹیو انشورنس بلڈنگ کے نام سے موسوم ہے۔ ان دنوں اس کا نام بال کرشنا بلڈنگ تھا اور یہ شاہراہ 'دی مال' کہلاتی تھی۔

میاں سعید، اصفہانی صاحب سے ملے اور ان کو پسند آئے۔ ان کو ستر روپے ماہوار کے مشاہرے کی ملازمت پیش کی گئی، میاں سعید نے قبول کرلی، ان دنوں یہ ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ میاں سعید فوراً ہی کلکتے روانہ ہوگئے جہاں ای ایف یو کا صدر دفتر تھا، وہیں ان کی انشورنس میں تربیت بھی ہوئی تھی۔ اس وقت نیوزی لینڈ کے مسٹر بیکسٹر جنرل منیجر تھے اور میاں سعید ان کے بڑے مداح تھے اس لیے کہ انھوں نے میاں سعید اور دوسرے نئے کارکنوں کو اعلیٰ عہدوں کے لائق بنانے کی تربیت دینے اور اور نئے نئے گُر سکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ انھوں نے اکثر صدیقی صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے جو خود تو انشورنس کی تکنیکی مہارت نہ رکھتے تھے مگر زیرِ تربیت نوجوان ملازمین کی 'کردار سازی' میں خود حصہ لیتے تھے۔ ملازمین اور افسروں کے درمیان 'ٹیم اسپرٹ' مثالی ہوتی رہی ہوگی اور یقیناً یہ اُن وجوہات میں سے ایک وجہ رہی ہوگی جس کی بنا پر کمپنی تیزی سے ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن تھی جب کہ وقت کے حالات مسلمانوں کے تجارتی اداروں کی کوششوں کے لیے ہرگز سازگار نہیں تھے۔ مناسب درجے کی انڈر رائٹنگ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی اس لیے کہ حالات کے مطابق کاروباری ضروریات منافعے کے لیے ضروری تھیں۔ سرمایہ کاری سے ہونے والی آمدنی کی حیثیت ثانوی تھی۔ آج کے مقابلے میں اس وقت کے انشورنس کے حالات قطعی مختلف تھے۔ اگر ہم ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کے ای ایف یو مالیاتی میزانیے پر نظر دوڑائیں تو پتا چلے گا کہ اس زمانے میں سرمائے پر منافعے کی شرح صرف تین اعشاریہ پانچ سے چار فی صد تک ہوا کرتی تھی اور ان دنوں زیادہ تر سرمایہ کاری گورنمنٹ بانڈ اور حکومتی تمسکات یا ڈی بینچرز میں کرنی پڑتی تھی۔ ہندوستانی حکومت کے تمسکات، کلکتہ امپرومنٹ ٹرسٹ، کلکتہ پورٹ ٹرسٹ، پنجاب بانڈ، کشمیر ریاست کے بانڈ وغیرہ جن میں قابلِ ذکر ہیں۔

میاں سعید کی تربیت ہوئی اور چیلنج کی ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز دنیا ان کے سامنے تھی۔ کلکتے میں ان کا قیام تین برس تک رہا، جب کہ اپنی سالانہ تعطیلات وہ اپنے والدین کے ساتھ لاہور میں گزارتے تھے۔ ان کی شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی اور ان کا پہلا بیٹا شوکت سعید احمد ۱۹۴۴ء میں تولد ہوا اور ۱۹۴۵ء کے اوائل میں ان کا خاندان کلکتے منتقل ہوگیا۔ مگر یہ ملاپ صرف چند ماہ تک ہی رہ سکا۔ اس لیے کہ کلکتے کے فسادات کی وجہ سے میاں سعید نے اپنے اہلِ خانہ کو لاہور روانہ کردیا اور سال کے آخر تک وہ خود بھی اپنا تبادلہ کراکے لاہور منتقل ہوگئے اور وہیں کمپنی کے فائر ڈپارمنٹ میں کام شروع کردیا۔ مگر جلد ہی ان کو ایک طرح کے فائر بریگیڈ کی خدمات انجام دینی پڑ گئیں اس لیے کہ اپنی جامع تربیت کی وجہ سے وہ 'ہرفن مولا' کی حیثیت اختیار کرگئے تھے اور انھیں ضرورت کی مطابق ایک شعبے سے دوسرے شعبے اور دوسرے سے تیسرے شعبے میں جانا پڑتا تھا۔ اس وقت تک اپنی محکم تربیت اور تکنیکی علم کی وجہ سے، اور سب سے بڑھ کر سرگرمی اور محنتی انداز میں کام انجام دینے کی صلاحیتوں، عادات اور کمپنی کے مفاد کے خیال رکھنے پر وہ اپنے ادارے میں مشہور ہوچکے تھے۔ ان کے بیٹے کے مطابق، ان کے نزدیک ای ایف یو ہی سب کچھ تھی، جس کی حیثیت دوسری بیوی کے مترادف ہوچکی تھی۔ کچھ تعجب نہیں کہ جب لائل پور شاخ کو ایک تجربے کار افسر کی خدمات کی ضرورت پڑی تو میاں سعید ہی سب سے بہتر انتخاب ٹھہرے اور ان کا تبادلہ کردیا گیا۔ کمپنی کے قدآور ڈپٹی جنرل منیجر نے خود ان کا انٹرویو کیا اور وہ اس نوجوان افسر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی وقت سے یہ طے پا گیا تھا کہ اس ادارے میں میاں سعید کے لیے ایک نہایت تابناک مستقبل فراہم تھا۔ جب ۱۹۵۹ء میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اس کمپنی میں میرا تقرر ہوا تو مسٹر آئیون نے کراچی چھوڑنے سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتایا تھا ان میں سعید بھی شامل تھے اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں ان کا خاص خیال رکھوں۔

ان دنوں کا لائل پور اور آج کا فیصل آباد ملک میں ابھرنے والی پارچہ بافی کی صنعت کے مراکز میں سے ایک تھا۔ لائل پور کاٹن ملز، کریسنٹ ٹیکسٹائلز اور کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز بڑی صنعتوں میں قابلِ ذکر تھیں۔ وہ میاں سعید ہی کی شخصیت تھی جس نے سہگل برادران سے دوستی کے رشتے استوار کیے اور میاں یوسف کی معیت میں، انھوں نے ای ایف یو کو بہت اچھے گاہکوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ رشتے آج بھی محکم ہیں اور اس طرح کہ ان صنعتوں کی اہم شخصیات آج ای ایف یو کے خاندان کے اہم اور اندرونی افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کمپنی سے میاں سعید کا اپنے ادارے سے تمسک اور ان کی دوستانہ شخصیت نے ان کو شہر کے تجارتی حلقوں اور اس کی تہذیبی شاخوں میں ممتاز کردیا۔ ان کے بے مثال اور نہایت دوستانہ کردار نے ان کو تجارتی شخصیتوں کا معیاری حصے دار بنادیا جو اسی قسم کی لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ مکمل طور پر بے تعصب اور کُلّی طور پر بے غرضانہ مشوروں کے لیے وہ ان ہی پر انحصار کرنے لگے تھے۔ ایک بے غرض، مذہبی اور دروں بیں قسم کی شخصیت ہوتے ہوئے ان کے اطراف ایک قسم کا مسحور کن حصار پیدا ہوگیا تھا، ایک کھلا ہوا ذہن جس میں کسی کے لیے بھی کسی قسم کے تعصبات کا گزر نہیں تھا جو پہلی بار عجیب سا لگتا تھا۔ وہ بہت ہی نفیس حسِ مزاح رکھتے تھے۔ ان کے پاس لطیفوں کا خزانہ تھا، بہت اچھے اور پُرلطف، اوچھے وار سے قطعی پاک۔ سکھوں کے بارے میں تو انھیں ہزاروں لطیفے یاد تھے۔ وہ جس طرح لطیفے سناتے تھے وہ ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ لطیفے سناتے وقت وہ اشاروں اور کنایوں کا استعمال بھی کرتے تھے، ساتھ ہی رحم دلی کا بھی اظہار کرتے جاتے تھے، اس طرح گویا لطیفوں میں شامل شخصیات کا کوئی قصور نہیں ہوتا اور ان سے سب کو ہمدردی کرنی چاہیے۔

میاں سعید کا ۱۹۵۹ء میں لاہور کے زونل چیف کی حیثیت سے تقرر کردیا گیا تھا، اس سے چند ماہ قبل جب میں کراچی پہنچا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے روشن علی بھیم جی کا تقرر ہوگیا تھا اور یہ طے ہوا کہ ساجد زاہد کے ساتھ، جو کمپنی کے ایگزیکٹو بنادیے گئے تھے، میاں سعید کو بھی ایک برس کے تربیتی کورس پر میونخ ری بھیج دیا جائے۔ پہلے تین ماہ ان دونوں نے جرمن ایلپس کے دامن میں واقع شہر Murnau میں جرمن زبان سیکھنے میں گزارے۔ اگرچہ ان دونوں کو جرمن زبان سیکھنا مشکل لگا تھا مگر انھیں اس پر کوئی تردد نہیں تھا۔ یہ

تضیعِ اوقات نہیں، ایک اچھی کوشش تھی، ایک دانشورانہ چیلنج تھی جو آگے چل کر ان کے جرمنی کو، بلکہ یورپ کو بھی سمجھنے میں معاون ہوگی۔ میاں سعید نے میونخ سے واپسی پر مجھ سے کہا تھا کہ ''ہمارا نظامِ تعلیم اکثر یہ فریب دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب برطانوی سلطنت کی تہذیب کے مماثل تھی۔ اس کا سیاسی نظام، تہذیب اور روایات وغیرہ مغربی تہذیب کے پرتو نظر آتے تھے۔ مگر میرے جرمنی میں ایک برس کے قیام نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور اب میں برّ اعظم یورپ کے مختلف النوع علاقائی ڈھانچے، ان کی بوقلموں نسلی اور علاقائی یگانگت اور اس کے باسیوں کو بہتر طور پر دیکھ اور سمجھ سکتا ہوں۔ بہر حال اس سفر نے مجھے یہ کچھ سکھایا ہے۔ میونخ اور وہاں کے میرے جرمن دوستوں کا یہ کرم ہے کہ انھوں نے اپنے شہر میں واقع اقبال کی یادگار دکھا کر مجھے ان کو زیادہ پڑھنے پر راغب کر دیا اور اب مجھے معلوم ہوا کہ جرمن ادیب اور فلسفیوں کو اقبال نے کیوں متاثر کیا تھا۔''

جرمنی سے واپسی پر میاں سعید کو مغربی پاکستان کا چیف منیجر بنا دیا گیا تھا، جو ایک اہم اور بڑا عہدہ تھا۔ انھوں نے کراچی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ان کا پورا خاندان، یعنی ان کی اہلیہ اور دو بیٹے، کراچی آ گئے جو اس وقت تک پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ ان کے بیٹے شوکت نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آغا حسن عابدی کے نہایت کامیاب بینکاری کے تجربے، یونائیٹڈ بینک میں ملازمت اختیار کر لی جس سے ایسٹرن فیڈرل یونین کے بہت اچھے کاروباری رشتے استوار ہوئے تھے۔

یہ زمانہ ایسٹرن فیڈرل کا سنہرا دور تھا، صرف لائف انشورنس کے لیے ہی نہیں جس میں اس ادارے نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے مثال پیش قدمی کی تھی۔ جنرل انشورنس کا کاروبار بھی بڑھا، اور میاں سعید نے بھی کامیابی کی اس نئی داستان میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔ میاں سعید کراچی منتقل تو ہو گئے تھے مگر، پکّے پنجابی ہونے کے ناتے وہ کراچی کو اپنا نہیں سکے۔ باوجود اس کے کہ مسٹر بھیم جی، معین الدین اور میں، ہم سب نے ان کو سہارا دیا تھا۔ وہ یہاں لاہور کو، اپنے لاہوری دوستوں کو، وہاں کی نہروں کو، قدیم مساجد اور 'اپنے لاہور' کی تاریخی یادگاروں کو یاد کرتے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ ان کو اپنے کاروباری رشتے اور اس سے منسلک ان کے دوست یاد آتے تھے۔ ہماری، دفتر میں بھی اور میرے گھر پر بھی، گھنٹوں زندگی کے اسی موضوع پر باتیں ہوتیں۔ کبھی تو وہ، اپنے کاروباری فرائض اور دل کی خفیہ خواہشات کے ٹکراؤ سے بہت ناخوش دکھائی دیتے تھے۔ کمپنی کے تمام اعلیٰ اور اہم عہدے دار اس بات کے قائل تھے کہ مطمئن میاں سعید ہمارے لیے زیادہ اچھا اثاثہ ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں کمپنی کی انتظامیہ میں بڑے پیمانے پر ایسا ردوبدل کیا گیا جو سب کے موافق ہو۔ میاں سعید کو لاہور بھیج دیا گیا اور آغا ناصر علی، جو جنرل انشورنس میں ایک کامیاب برانچ منیجر اور زونل منیجر ثابت ہو چکے تھے، کراچی تبدیل کر دیا گیا۔ آغا صاحب کو لائف انشورنس کے شعبے میں نوتشکیل شدہ گروپ انشورنس کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ میاں سعید لاہور میں رہے اس کے باوجود مغربی پاکستان کے چیف منیجر ہی رہے۔

بدقسمتی سے ۱۹۶۶ء میں ان کی اہلیہ ایک حادثے کا شکار ہو کر جسمانی طور پر چھ برس تک معذور رہی تھیں۔ ان کے لیے کراچی کا یہ زمانہ دردناک رہا تھا جس نے ان کی سماجی اور ذاتی زندگی پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس حادثے نے انھیں ایک حساس اور دردمند شوہر کے روپ میں اُجاگر کیا۔ بالآخر ان کی اہلیہ معذوروں کی گاڑی سے نکل کر اپنے پیروں چلنے لگیں، اور بلاشبہ یہ میاں سعید کی ان سے والہانہ محبت اور انتھک خدمات کا نتیجہ تھا۔ اس میں ان کے دونوں بیٹوں کی اخلاقی امداد بھی شامل رہی تھی۔

شوکت اور ان سے پانچ برس چھوٹے بھائی دونوں اپنے والدین کو اچھے کلمات میں یاد کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے والد کے لیے بے حد احترام کے جذبات موجزن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد اسکول ماسٹروں کی طرح اپنے سخت اصولوں کی پابندی کراتے تھے مگر وہ انسانی اور اخلاقی عادتوں کی نشوونما کا بہت خیال رکھتے تھے۔

میرے Tutzing کے گھر میں بیٹھے ہوئے شوکت نے اپنے والد کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا، ''میری تعلیم کے دوران، اسکول کی ہو

یا کالج کی، میں جو کچھ بھی کرتا تھا، والد صاحب اس میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ وہ میرے استادوں سے برابر رابطے میں رہتے اور میری تعلیمی نشوونما کے بارے میں معلومات لیتے رہتے تھے۔ وہ اس وقت بہت بے چین ہوتے جب یہ دیکھتے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہو رہا ہے۔ ویسے وہ بہت مہربان، نرم خو اور منکسر المزاج انسان تھے۔ مگر وہ مکمل نظم وضبط پر اصرار کرتے تھے۔ وہ ہمیں ڈرائیوروں کے ساتھ کبھی نہیں بھیجتے تھے۔ ہم یا تو پیدل چلتے یا پھر بائیسکل استعمال کرتے تھے۔ اور ہمیں شام ڈھلنے سے قبل ہی گھر واپس ہونا ضروری ہوتا تھا۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ ایک شام میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہر میں پیراکی کے لیے چپکے سے نکل گیا تھا۔ والد نے ہم دونوں کے لیے اس کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اور جیسا کہ اکثر ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، اتفاق سے وہ اُدھر سے گزرے اور میں پکڑا گیا۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ اگلی صبح کو مجھے حجام کے پاس لے کر گئے اور سزا کے طور پر میرے سر کے بال منڈوا دیے۔ یہ بہت بڑی سزا تھی، مگر ایک سبق بھی تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔''

میاں سعید سخت نظم وضبط کے قائل تھے، اپنے لیے بھی اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے بھی۔ شوکت کہتے ہیں کہ ''مگر وہ جو بھی قدم اٹھاتے، ہم دونوں بھائیوں کو اس کا یقین تھا کہ وہ ہماری بھلائی اور ہم دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی ہوگا۔''

شوکت یونائیٹڈ بینک میں ملازم ہو گئے تھے اور ان کی ذمے داری بینک کے سب سے اہم کھاتے دار شیخ زید بن سلطان النہیان، ابوظہبی کے حاکم کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ صدی کے چھٹے عشرے تک ابوظہبی سے تیل نکلنا شروع ہو گیا تھا اور اچانک شیخ کا شمار دنیا کے امیر ترین اشخاص میں ہونے لگا تھا۔ انھوں نے ملک سے باہر سفر شروع کر دیا تھا اور آغا حسن عابدی ان کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آغا صاحب نے جو بہت سے کام کیے تھے ان میں ایک کام یہ بھی تھا کہ یونائیٹڈ بینک میں ایک استقبالیہ قائم کر دیا تھا جس کا کام صرف اہم کھاتے داروں کی خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔ شوکت اس محکمے کے ایک رُکن بنا دیے گئے تھے مگر انھیں یہ کام بالکل پسند نہیں تھا۔ ''ہم بینکر ہیں یا ہمارا کام دلالی کرنا ہے۔'' ان کا مشہور جملہ تھا جب وہ اپنے اعلیٰ ترین افسر کے روبرو اپنی ذمے داریوں کی شکایت کرتے ہوئے پھٹ پڑے تھے اور ۱۹۶۹ء میں یونائیٹڈ بینک چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے یہ قدم اٹھانے سے قبل اپنے والد اور مسٹر بھیم جی سے مشورہ نہیں کیا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دونوں آغا صاحب کے قریبی دوست ہیں۔ دونوں حضرات نے شوکت کے ردِعمل سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد شوکت نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسٹرن فیڈرل یونین میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان سے پہلے بہت سے بیٹے اپنے والدوں کی طرح، جنھوں نے اس ادارے کی وفاداری سے خدمت کی تھی، اس ادارے میں شامل ہو چکے تھے۔ شوکت سے پوچھا گیا کہ وہ سعودی عرب میں کھلنے والی کمپنی کے شاخ میں تبادلہ پسند کریں گے یا نہیں۔ ان کے والد نے ان کو اس کے قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ جرمنی میں اپنے قیام کے دوران شوکت کو اپنے ملک کے ساحل کو چھوڑ کر غیر ملکی تہذیب کے تجربے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے والد کا مشورہ قبول کر لیا۔ شوکت کے والد نے ۱۹۷۹ء میں، جب شوکت کا تبادلہ منیجر کی حیثیت سے فیصل آباد میں کر دیا گیا تھا، بہت مدد کی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی تین عشرے قبل جہاں ان کے والد تعینات تھے اور انھوں نے کمپنی کے ایک ہونہار افسر کی حیثیت سے ایک نہایت کامیاب مستقبل کی ابتدا کی تھی۔

''شروع شروع میں میرے والد، والدہ کے ہمراہ تقریباً ہر ہفتے فیصل آباد آتے۔ اور ہم ایک ساتھ میرے دفتر جاتے۔ وہ ہر کلیم کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرتے اور جہاں ضرورت ہوتی تبادلۂ خیالات کرتے۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوتا تھا۔ اتنی قربت کے باوجود میرے لیے یہ کبھی ممکن نہ ہوا کہ میں ان کے دل اندر جھانک کر دیکھ سکتا، اگرچہ میرا خیال تھا کہ وہ میری کوشش پر خوش ہوتے۔ مگر ان کے بارے میں میرے دل میں احترام کے گہرے جذبات آڑے آ جاتے تھے، جن کو میں کبھی عبور نہیں کر سکا۔ ایک مثال دینا چاہوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں تمباکو نوشی کرتا ہوں، اور میری یہ بہت پرانی عادت ہے۔ مگر زندگی بھر میں نے ان کی موجودگی میں تمباکو نوشی کی جرأت نہیں

کی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تمباکونوشی کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے میں جلدی سے سگریٹ بجھا کر اپنی دونوں انگلیوں بجھا کر پتلون کی جیب میں ڈال لیتا۔ ایسا کرنے میں کئی بار میری انگلیاں بُری طرح جل گئی تھیں اور میرے جیبوں میں سوراخ ہوگئے تھے۔ وہ دیکھ کر مسکرا دیتے اور کہتے، 'بیٹا، مجھے علم ہے کہ تم تمباکونوشی کرتے ہو، تو پھر تم میرے سامنے اس کو چھپانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟' میں ان کو بھلا کیسے بتاتا کہ باپ کی حیثیت سے آپ کے لیے میرے دل میں جو احترام ہے اور آپ نے مجھے جو کچھ سکھایا ہے اس کو بھلانا میرے لیے ممکن نہیں۔''

کمپنی کے لیے سعید صاحب کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ایک رُکن کی حیثیت سے ان کو منتخب کر لیا گیا تھا اور ۱۹۷۶ء سے رفتہ رفتہ وہ کمپنی کی ذمے داریوں سے فارغ ہو گئے۔ ان کے کم عمر ساتھی سلطان احمد نے ان کی جگہ لے لی۔ سلطان احمد بعد میں کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو بن گئے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ ایڈوائزر بنا دیے گئے اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں پینسٹھ برس کی عمر میں ریٹائر ہو گئے۔ انھوں نے مجھے بہت خوب صورت خط لکھا تھا، جس میں مستقبل کے منصوبے تھے۔ انھیں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے والد کی طرح زراعت پر توجہ دینا چاہتے ہیں جو ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ مگر ۲۲ نومبر ۱۹۸۶ء میں دل کے عارضے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دو برس بعد ان کی بیوی بھی چل بسیں۔ اگر چہ حادثے سے وہ بہ خوبی جاں بر ہوگئی تھیں مگر شوہر کے انتقال کے بعد انھیں زندہ رہنے میں کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔

شوکت کے مطابق، ''ان کی زندگی ہی انشورنس تھی۔ کچھ باغبانی اور کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ برج کھیل لینا۔ مگر آخری وقت میں تو صرف انشورنس ہی ان کی مصروفیت رہ گئی تھی۔ اس کے چھٹنے کے بعد زندگی میں کچھ نہیں رہ گیا تھا، اس لیے شاید انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔''

مگر میاں سعید ابھی زندہ ہیں، اس ادارے، ایسٹرن فیڈرل انشورنس کی روزمرہ کی زندگی میں، جس سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ ان کے بیٹے شوکت اپنے والد کے مشن سے وابستہ ہیں اور ان کا پیغام آگے بڑھا رہے ہیں۔ اپنے والد کی تعلیمات کی روشنی میں وہ کمپنی کے زونل آفس لاہور میں ایک اعلیٰ ترین افسر کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ اور پانچ عشروں میں میاں سعید کے بنائے ہوئے زیادہ تر گاہک اب بھی کمپنی کے ساتھ ہیں اور ان کے بیٹے کے ہاتھوں اسی قسم کی خدمات سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

کمپنی کے ڈائریکٹر جناب جہانگیر صدیقی اپنے کاروبار کے سلسلے میں برابر لاہور جاتے رہتے ہیں۔ ایک بار شوکت ان سے ہوائی اڈے پر ملے اور ان کو اپنی کار میں چھوڑنے جا رہے تھے۔ راستے میں صدیقی صاحب نے شوکت سے سوال کیا کہ ''مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگ ای ایف یو کے گاہکوں کو اتنے عرصے تک کس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہیں، اس کا پس منظر کیا ہے؟'' شوکت نے جواب دیا، ''جناب، یہ میاں صاحب کی رکھی ہوئی بنیاد ہے، اور اتنی مستحکم ہے کہ یہ لوگ خود ہی ہم کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ سہگل، نون، الیکٹرک امپیریل اور بہت سے آج بھی ہمارے ہیں۔ ان کے کاروبار کو میرے والد نے کمپنی سے متعارف کرایا تھا، اور یہ لوگ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کی اُسی معیار کی خدمت کر سکتا ہوں جیسی کہ میرے والد کیا کرتے تھے۔ یہ میرے والد ہی کا فیض ہے کہ ان لوگوں کے کاروبار کا ۹۹ فی صد میرے پاس ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔''

اسی کو میرے دوست اور ساتھی مرحوم میاں سعید 'لاہوری کنکشن' کہا کرتے تھے۔ مجھے لاہور کا ۱۹۶۰ء کا بہار کا موسم اب بھی یاد ہے۔ وہ برانچ منیجر تھے اور ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ لاہور کا پرانا ہوائی اڈہ بہت چھوٹا سا تھا، بالکل کسی گودام کی طرح۔ مسافروں کو الوداع کہنے والے ایک نیچے سے جنگلے سے الگ رہ جاتے تھے، چند گز کے فاصلے پر، اتنے قریب کہ تار کی جالیوں کے اوپر سے ہاتھ ملایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے مجھے بہت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اور فوراً ہی میرے جرمن ساتھی اِروِن سی آئیون کی تعریف کرتے ہوئے

کہا، ''اگر وہ نہ ہوتے تو شاید میں کامیاب نہ ہوتا۔ میں کسی معروف خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا مگر ان کو مجھ پر اعتماد تھا اور انھوں نے مجھے لائل پور شاخ کا منیجر بنا دیا تھا۔'' اور پھر وہ اپنی شاخ کے کاروبار کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاتے رہے۔ اس وقت کمپنی کا دفتر شہر کے مرکز میں تھا، جو آج بھی وہیں ہے، اور جو اس دفتر کو قائم رکھے ہوئے ہے اسی کمپنی کے ایک افسر ہیں جو کمپنی کے ملازمین کی تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ویسی ہی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا نام قنبر حمید ہے اور وہ کمپنی کے زونل آفس میں ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے والد جناب اختر حمید، جن کی اب عمر پچھتر برس ہو چکی ہے، ای ایف یو کے زونل آفس کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے، اور ان کے خسر، جناب حق بھی اسی کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں ملازم رہ چکے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم روایت، جسے میاں سعید اپنی زبان میں 'لاہوری کنکشن' کہتے تھے!

ایک دفعہ ہم لاہور کے معروف ہوٹل فلیٹیز جا رہے تھے۔ وہی لاہور کا پرانا ہوٹل جو اپنی وسیع، خوب صورت خواب گاہوں، بڑے بڑے ملاقاتی کمروں اور سرد موسم میں استعمال میں آنے والے اصلی آتشدانوں کے لیے مشہور تھا۔ ہوٹل جاتے ہوئے راستے میں رُک کر میاں سعید نے برونز میٹل سے بنی ہوئی سبز، دُنیا بھر میں مشہور 'زمزمہ' توپ دکھائی چاہی جس کو ہم اس وقت سے Kims' Gun کے نام سے جانتے تھے، جب ہم نے رَڈیارڈ کپلنگ کا مشہور ناول پڑھا تھا۔ یہ توپ مال روڈ کے درمیان، یونی ورسٹی کے بڑے ہال کے سامنے نصب ہے۔ میاں سعید مجھے مغل شہنشاہوں اور لاہور سے ان کی وابستگی کے بارے میں بہت کچھ پہلے ہی بتا چکے تھے۔ یہ بھی کہ یہ توپ برّصغیر میں ڈھالی جانے والی سب سے بڑی توپ تھی جو ۱۷۶۱ء میں شاہ ولی خان نے بنوائی تھی۔ اور پھر انھوں نے مجھے اس پر کندہ تحریر 'The Zam-zamah The taker of Strongholds' دکھائی۔

میاں سعید نے کہا کہ میں اس توپ کے سائے میں بڑھ کر جوان ہوا ہوں اور جب بھی مجھے ضرورت پیش آئی ہے، میں نے اس پر کندہ جملے 'the taker of strongholds' سے ذہنی توانائی اور استقلال حاصل کیا ہے اور مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ میں اس مشکل کو حل کر لوں گا۔''

سیّد سبطِ حسن

جتنے بڑے ادیب اتنے ہی بڑے آدمی

سبطِ حسن کے رُتبے کے آدمی کا خاکہ لکھنا ہر شخص کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا۔ ایسے انسان کے بارے میں لکھنے میں انصاف کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے جو نہ صرف اپنے وقت کا ایک بڑا ادیب، مفکر اور فلسفی ہو بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک بہت متنازعہ سیاسی شخصیت بھی ہو۔ ایسا بے غرض انسان جس نے اپنے لامتناہی خوابوں، حقوقِ انسانی اور اپنے وطن کے پسے ہوئے عوام کے بہتر مستقبل کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں عمر بھر کے خواب چکنا چور ہوتے دیکھنا پڑ رہا ہو۔

اس نرم خو، تہذیب یافتہ اور اعلیٰ صلاحیتوں سے بھرپور انسان کو میں قریب سے جانتا تھا۔ اس کی حیات اس مختصر سے خاکے سے زیادہ تفصیلی تذکرے کی حق دار ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کا حق ادا کروں کہ اس کی زندگی بہت سے حیرت انگیز پہلوؤں، بہت سے بدنما اور مسرت کے لمحات سے مملو تھی۔

سید سبطِ حسن مشرقی یو پی، ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ صوبہ بہار سے ملا ہوتھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں، عین اس زمانے میں ہوئی تھی جب پہلی عالمی جنگ جاری تھی۔ ان کے والد کا خاندان بڑے زمینداروں کا تھا، والدہ بھی جاگیردارانہ پس منظر رکھتی تھیں۔ وہ نواب باغ بنارس کی بیٹی تھیں اور عیش وعشرت کی پروردہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چھوٹی موٹی خدمت پر بھی انعام کے طور پر سونے کے سکّے دینے کی عادی تھیں، اس وقت بھی جب ان کا خاندان اس اسراف کا متحمل نہیں تھا۔ نوشابہ زبیری کے الفاظ میں، ''وہ دیکھنے میں بھی نواب خاندان کا فرد لگتی تھیں۔'' سید صاحب کی بیٹی نوشابہ زبیری ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نفیس اور پُرکشش خاتون ہیں۔ وہ اسکول میں استانی کے فرائض سے سبکدوش ہو چکی ہیں اور اپنے آرام دہ مکان میں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں برسوں قبل، اپنی اہلیہ کے ہمراہ ان سے مل چکا تھا جب وہ اسی شہر میں رہتی تھیں اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان سے میری مختصر سی ملاقات ای ایف یو کی گولڈن جوبلی کی تقریبات میں بھی ہو چکی تھی۔ مگر اس بار جب میں ان سے ملا تو پہلی دفعہ میں نے اُن سے ان کے مرحوم والد کے خاندانی پس منظر، اُن کی کامیابیوں اور زندگی میں جدوجہد کے بارے میں باتیں کرنی چاہیں جس کی ایک چاہنے والی اور قریبی شخصیت سے توقع کی جاسکتی ہے۔ جس طرح انھوں نے اپنے والد کی زندگی کے مختلف نوع کے واقعات بیان کیے اس میں ان کی تعریف بھی تھی اور ایک طرح کا احساسِ طمانیت بھی۔ اس دوران مجھے یہ بھی فوراً ہی محسوس ہوگیا کہ ان کے تعلقات اور ان کے محسوسات صرف ایک عام باپ بیٹی جیسے نہیں تھے، جیسے کہ دنیا کے اس خطے میں ہوا کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اپنے والد کے تذکرے کے دوران جذبۂ تعریف بھی تھا اور احساسِ تفاخر بھی، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ جذبہ اور یہ احساس انھیں اپنے والد کی تعلیمات اور آزاد ذہن کی مدد سے ایک فاصلے سے دیکھ کر پیدا ہوا تھا جو اپنی راہ چلنے اور اپنے انفرادی انداز سے سوچنے کا عادی ہو۔ وہ کشاں کشاں، مجھے اپنے جذبات کی وادیوں

سے لے گئیں مگر مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے مواقع پر جس قسم کی جذباتیت در آتی ہے وہ اس سے اپنا دامن بچاتی رہیں۔ میں ان کے اس انداز کا شکر گزار تھا اس لیے کہ میں جو تصویر دیکھ رہا تھا وہ زیادہ شفاف اور قابلِ قدر ہوگئی تھی۔

انھوں نے کہا، ''جی ہاں! میرے والدین کے خاندان اس روایتی اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے تھے جیسی کہ اس زمانے کے اشرافیہ اور جاگیردار گزارتے تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، اپنی عمر کے آخری دنوں تک میری نواب زادی دادی بالکل ویسی ہی رہیں۔ وہ اسی قسم کے لباس استعمال کرتی تھیں جیسا کہ اس درجے کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ کی پروردہ تھیں اور اپنے ان اطوار کو تبدیل نہیں کر سکی تھیں جو اس تہذیب کا خاصہ تھے۔ مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ جس خاندان میں وہ بیاہ کر آئی تھیں اس کے حالات ۱۸۵۷ء کے دور کے بعد یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ بلا شبہ ان میں ان کے خاندان کے کچھ افراد ملوث تھے اور جب انیسویں صدی میں ہندوستان کے اس علاقے میں ریلوے کی تعمیر شروع ہوئی تھی اور اس کے لیے زمین کی ضرورت پڑی تو انھیں لوگوں سے حاصل کی گئی جو اس نام نہاد 'بغاوت' کے ملزم تھے۔ اس کے نتیجے میں میرے والد کے بزرگوں کی زمین کا خاصا بڑا حصہ زبردستی لے لیا گیا تھا۔ میں اپنے دادا سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھی اس لیے کہ میرے بچپن کے دوران ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ مگر میں نے سنا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں ان کے خاندان کی شمولیت کی وجہ سے ذاتی سطح پر ان کو بہت صعوبتیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ اس کا اثر میرے والد پر بھی پڑا تھا، اس لیے کہ جب میرے دادا کا انتقال ہوا تھا اس وقت میرے والد تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ بی۔اے کر رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک انھوں نے ملازمت شروع نہیں کی تھی۔''

سبطِ حسن نے الٰہ آباد اور بعد میں علی گڑھ میں، جو ہندوستان کی مسلم اُمہ کے عظیم اذہان کی تربیت گاہ تھے، تعلیم پائی تھی۔ وہاں جس قسم کے لوگوں سے ان کا تعامل ہوا تھا، اور ان کے دادا کے لیے کام کرنے والے کسانوں کو دیکھ کر جس قسم کے تجربات ہوئے تھے، انھوں نے ان کے تنقیدی دماغ کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ وہ اپنی تعطیلات اپنے نانا کے ہاں گزارتے تھے۔ وہ لوگ بڑے زمیندار تھے، جن کی زمین پر بہت سے کسان کام کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زمینداری اور جاگیرداری اپنے شباب پر تھی، جب کسان جاگیرداروں کی زمین سے بندھے ہوتے تھے، گویا یہ ایک قسم کی غلامی تھی۔ ''اور میرے والد وہاں اپنی چھٹیاں گزارتے تھے، وہ گاؤں میں جاتے اور خود غریب کسانوں کے حالات دیکھتے تھے۔ کسان جو کچھ بھی پیدا کرتے وہ زمیندار کی ملکیت ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے کی ہوئی محنت کے عوض کسان کو صرف ایک معمولی سا حصہ دیا جاتا تھا۔ میرے والد کو یہ چیزیں پسند نہیں تھیں۔ وہ کسانوں سے کہتے، بلکہ انھیں اکساتے کہ وہ زمینداروں کو کچھ نہ دیں، حالاں کہ وہ خود زمینداروں میں سے ایک کے نواسے تھے۔ وہ ان لوگوں کے حقوق کے علم بردار بن گئے تھے جنھیں ریاست کے جاگیردار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور اپنی غلامی میں رکھتے تھے، جس سے میرے والد کو نفرت ہوگئی تھی۔ ان کی زبانی ہنر مندی حیرت انگیز تھی حالاں کہ وہ شرمیلے اور خود بیں قسم کے ایک خاموش طبع انسان تھے۔ کم از کم اپنے زندگی کے نشوونمائی دور میں، اپنے سماجی رُتبے کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے لیے ایک ناقابلِ قبول قسم کا قد تراش لیا تھا تاکہ ان کی اپنی شناخت قائم ہو سکے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ نہ ان کو زیب دیتا ہے نہ اس ماحول سے میل کھاتا جس میں ان کی پرورش ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں میری والد کی کوئی خاص عزت نہیں تھی جن کے سماجی کردار پر وہ تنقید کیا کرتے تھے، کم از کم میری والدہ اور میری دادی نے یہی کچھ مجھے بتایا تھا۔ میرے والد غریب کسانوں کی قسمت تو بدل نہیں سکتے تھے مگر کسانوں کو اپنے مالکوں سے زیادہ اجرت طلب کرنے کی جُرأت دینے میں کامیاب ہوگئے، جن میں ان کے دادا شامل تھے، اور آخر کار کسان اس ڈگر پر چل پڑے۔ اس زمانے میں یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس لیے لوگ ان کے اتنے شکر گزار ہوئے کہ انھیں کندھوں پر اٹھائے پھرے۔ تو صحیح معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سبطِ حسن اپنی زندگی کے اوائل ہی سے غریبوں کے لیے لڑتے رہے، حالاں کہ صحیح معنوں میں وہ کچھ زیادہ حاصل نہیں کر سکے، اس لیے کہ وہ تنہا تھے۔''

ابتدائی تجربے نے انھیں سکھایا ہوگا کہ صرف ایک تنہا ذات کچھ زیادہ حاصل نہیں کرسکتی، کم از کم سیاسی معنوں میں۔ اور پھر جلد ہی ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہوگئے جن کے خیالات اور امنگیں ان جیسی تھیں۔ سب ان ہی کے انداز میں سوچنے لگے اور آہستہ آہستہ سبطِ حسن بے دین مفکرین کی طرح مارکس اور لینن کے سیاسی دھارے میں شامل ہوگئے اور 'Communist Internationale' کے ایک فعّال کارکن بن گئے تھے۔ نوشابہ نے بتایا کہ انھوں نے خود کو علی گڑھ یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر اشرف کے سانچے میں ڈھال لیا تھا جو شاید پولیٹیکل سائنس کے شعبے کے سربراہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اشرف نے بہت سے مضامین لکھے، وہ ایک زبردست مقرر تھے مگر انھوں نے کبھی کوئی مکمل کتاب تصنیف نہیں کی تھی۔ مگر سبط بھائی کی بیٹی کو یقین ہے کہ ڈاکٹر اشرف ہی وہ شخص تھے میرے والد جس سے متاثر ہوئے تھے اور انھیں کے سانچے میں خود کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف یقیناً مارکسی رہے ہوں گے، جس طرح سبطِ حسن اور ان کے سارے دوست اعلیٰ تعلیم یافتہ عمیق مطالعے والے اور بہت بولنے والے تھے۔ ان کا زیادہ وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ ان کے دروازے ان تمام ذہین دماغوں کے لیے کھلے رہتے تھے جو نصف صدی کے عرصے میں ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی میں آگے آگے ہوتے تھے مگر انھوں نے اس سے پہلے اتنی لگن سے کام نہیں کیا تھا۔ گاندھی، نہرو اور جناح جیسے لوگ سبطِ حسن اور ان کے ساتھیوں سے واقف تھے اور ان دنوں ان لوگوں کی ان مشاہیر سے ملاقات بالکل آسان بات تھی۔

بہت جلد یہ بات بھی آشکار ہوگئی کی سبطِ حسن کو لکھنے کا بھی شوق تھا جس پر انھوں نے دل لگا کر محنت کی تھی اور ان کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ ان کا قلم کسی قابل تھا۔ ان کے دوستوں نے بھی ان کو ادب کا پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے ترقی پسند انجمن میں شمولیت اختیار کرلی تھی جو برطانیہ اور اس کے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ان لوگوں نے بہت سے رسالے اور پمفلٹ شائع کیے جس کے مضامین اربابِ اختیار کو پسند نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اپنی تحریروں کو علی گڑھ سے باہر منتقل کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔ وہ اپنے مضامین کو جھابیوں میں بچھا کر ان پر آم کی تہیں لگا کر ان کو ملک کے بہت سے مراکز کو روانہ کردیتے۔ اپنے برطانوی آقاؤں کو جھانسا دینے میں نہ صرف وہ بہت آسودگی محسوس کرتے تھے بلکہ انھیں یک گونہ لطف بھی حاصل ہوتا تھا۔

اس قسم کی تمام حرکتیں بہت وقت مانگتی تھیں اور سبطِ حسن کے ذہن کو بھٹکاتی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے بی اے کرلیا مگر قانون کی سند حاصل کرنے میں ناکام رہے، جس کا انھیں ہمیشہ افسوس رہا۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ چلے گئے جو ان دنوں برطانوی ہندوستان میں دانش اور تہذیب کے اہم مرکزوں میں سے تھا۔ ان کو اس خوب صورت، سرسبز شہر سے عشق ہوگیا، جس کو 'باغِ ہند' کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ اس زمانے میں اودھ کے نوابوں اور تعلقے داروں کا شہر تھا۔ مختلف درجے کے سیکڑوں نواب اور تعلقے دار مستقل طور پر وہاں آباد ہوگئے تھے اس لیے ان میں صرف چند ہی تھے جن کے جائیدادیں بچ رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر 'وسیقے' پر زندہ رہتے تھے۔ وسیقہ اس سود کو کہتے تھے جو ماہ بہ ماہ ان لوگوں کو ادا کیا جاتا تھا، اودھ حکمرانوں کے سنہرے دور میں برطانوی حکومت نے جن سے قرضے حاصل کیے تھے۔ جاگیرداری کا اپنی تمام چمک دمک اور خرابیوں کے ساتھ لکھنؤ پر راج تھا۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اس موضوع کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

لکھنؤ کوئی تجارتی مرکز نہیں تھا۔ وہاں کھانے والے تمباکو کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا اور کچھ عطر بنانے والے اداروں پر ہی ان دنوں وہاں کی تجارت مشتمل تھی۔ مگر یہ شہر مسلمان شاعروں اور مصوروں کی قیام گاہ بنا ہوا تھا، اگر چہ بہت سے برہمن خاندان بھی اس کے اطراف آباد تھے۔ اس طرح لکھنؤ مختلف فنونِ لطیفہ، متضاد فلسفیانہ طریقوں کا سنگم تھا، جس میں تیئس برس کا ایک نوجوان اپنے سیاسی ہدف کے لیے نشانے تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ سبطِ حسن نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی پہلی ملازمت انگریزی اخبار Pioneer سے شروع کی۔ انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہوگا اس لیے کہ بہت جلد نہ صرف لکھنؤ بلکہ وہاں کی دانش کی سرحدوں سے باہر بھی روّیوں کی تشکیل کرنے

والے کی حیثیت سے ان کا نام لیا جانے لگا تھا۔ سبطِ حسن بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے مگر ان کی اصل محبت اردو زبان سے تھی۔ ایک کتاب کے سوا، جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، ان کی ساری تصنیفات اردو زبان ہی میں تھیں۔ انھیں لکھنؤ کا عالمانہ ماحول پسند تھا مگر جب حیدرآباد دکن کے اردو اخبار 'پیام' کے مالک نے اپنے اخبار کے ایک حصے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھیں کام کرنے کی دعوت دی تو بلا کسی تامل کے سبطِ حسن نے قبول کرلی۔ اس وقت اخبار کے مالک پروفیسر غفار تھے جو بہت جلد سبطِ حسن کے گرویدہ ہوگئے۔ سبطِ حسن کی بیٹی نوشابہ زبیری کہتی ہیں، جنھیں وہ ایک بیٹے کی طرح سمجھتے تھے، کہ ان دنوں بیشتر صحافی بائیں بازو کے خیالات پیش کرتے تھے۔ سبطِ حسن کا بھی ویسا ہی انداز تھا جس کی وجہ سے نظام حیدرآباد کے ریاستی کارندے انھیں ہراساں کرتے تھے۔ کیا سبطِ حسن نے حیدرآباد اسی وجہ سے چھوڑا تھا یا کمیونسٹ پارٹی نے انھیں اپنی جگہ بدلنے کے احکامات جاری کیے تھے، اس پر بحث کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس پارٹی کو میرے ملک جرمنی کے مشرقی حصے سے ہدایات دی جاتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ سبطِ حسن جو اپنی پارٹی کے نہایت فعال کارکن تھے خود سے فیصلے نہیں کرتے تھے، سوائے اس کے جو پارٹی کے مقتدر ارکان ماسکو سے جاری کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے پینتالیس برس بعد ۱۹۹۰ء میں بالآخر سوویت یونین کی کمیونسٹ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا (چار سال قبل ہی، ۱۹۸۶ء میں، سبطِ حسن کا دہلی کے ہوائی اڈے پر انتقال ہوگیا، جب وہ لکھنؤ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات میں حصہ لینے کے بعد اپنے وطن پاکستان واپس آرہے تھے۔ (مترجم بھی اس وقت ہندوستان میں موجود تھا۔)

یہ صرف خوش قسمتی یا اتفاق نہیں تھا کہ ۱۹۴۶ء میں سبطِ حسن کو امریکا کی کولمبیا یونی ورسٹی نے پولیٹیکل سائنس پڑھنے کے لیے اسکالر شپ دے دی تھی جہاں سے سبطِ حسن ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ دنیا کے مشہور اخبار 'New Age' کے نمائندے کے طور پر کام کرنے کے باعث اقوامِ متحدہ میں بھی عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب بین الاقوامی اشتراکیت کے خلاف میکارتھی اور اس کے ساتھی تحریک چلا رہے تھے۔ اس لیے سبطِ حسن بھی نشانہ بنے اور امریکی اربابِ اختیار نے ان کو ملک سے نکال دیا۔ سبطِ حسن کے ملک بدر کیے جانے کے دوسرے دن امریکا کے سربرآوردہ صحافیوں نے اخبار سے احتجاج کیا اور سبطِ حسن کے احترام میں اپنے مضامین دینے سے انکار کردیا تھا جو ان کے لیے امریکی ساتھیوں کے احترام کا منھ بولتا ثبوت تھا۔

سبطِ حسن امریکا سے ملک بدر ہونے کے بعد واپس ہندوستان نہیں گئے، ان کی پارٹی نے انھیں پاکستان جانے کی ہدایت کی جو اس وقت پاکستان میں سر اُبھار چکی تھی۔ سبطِ حسن کو یہ احکامات اس وقت ملے تھے جب وہ امریکا سے نکالے جانے کے بعد چند ماہ کے لیے لندن میں ٹھہر گئے تھے۔ نوشابہ سوال کرتی ہیں کہ ''واقعی کیا یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ تین ایسے افراد کو ہندوستان کے اس علاقے میں بھیجنا جہاں وہ کبھی نہیں گئے تھے، نہ وہاں کی زبان سے واقف تھے، نہ تہذیب سے تاکہ کمیونسٹ حلقے قائم کریں اور جلد سے جلد 'عالمی انقلاب' کی راہ ہموار کریں، کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے والد کو بھی بڑے شبہات رہے ہوں گے، وہ، ان کے قریبی دوست سجاد ظہیر اور ایک اور صاحب کو، جن کا نام مجھے یاد نہیں، پارٹی کا حکم بجالانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب سب کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پارٹی کے ان سپاہیوں کے ساتھ کیا ہورہا تھا جنھوں نے وہ کچھ نہیں کیا جس کا حکم دیا جارہا تھا؟''

توقع کے مطابق نیا ملک اور نیا علاقہ سبطِ حسن اور ان کے گہرے سیاسی اعتقادات کے لیے کچھ آسان نہیں تھا۔ ان کے سیاسی اعتقادات سے متفق، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض جیسے اور بہت سے ادیب اور شاعر، دانش ور افراد کی، جو خود کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ کہتے تھے، کوئی کمی نہ تھی۔ قائدِ اعظم کے بنیادی تصور کے مطابق پاکستان کو کبھی مذہبی ریاست نہیں بننا تھا، برداشت سے اتنا عاری اور منتقم نہیں جتنا کہ یہ آج بن چکا ہے۔ اس میں 'اللہ کی حکومت' قائم کرنا مقصد نہیں تھا مگر اس نوزائیدہ ریاست کو ویسی ہی جمہوریت، اور ویسے ہی اجتماعی، برداشت کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا، اسلام کے بنیادی احکام جن کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایک ملک جو بالآخر اسلام اور ہندو مہاسبھا کے

درمیان صدیوں پرانی جاری جنگ کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

سیاست داں اور تاریخ داں جو کچھ بھی کہیں، اگر ایک لادین عالمی انقلاب ایسے ہزاروں ملّاؤں سے جنگ میں مصروف ہو جو کروڑوں غیر تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں اور اچھے یا بُرے خیالات پر اثر انداز ہوں گے تو کیا نتائج نکل سکتے ہیں، یہ ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے تبدیل کرلیں، خدا کی جگہ لینن، اسٹالن یا کسی اور کمیونسٹ لیڈر کو رکھیں؟ انجیل یا قرآن کے مقابلے میں کارل مارکس اور ولادی میرالیانوف لینن کو تصور کرلیں؟ نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہیں نکلے گا!

سبطِ حسن جیسی دانش اور جذباتی سطح کے انسان کا کسی بھی قسم کے رومانوی بہادری کے اصولوں سے معاملہ مشکل ہوتا ہے۔ وہ بہت سنجیدہ اور متوازن شخصیت کے انسان تھے۔ بس ان کے ساتھ ایک ہی طرح کا جنون سا تھا جس نے ساری عمران کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایشیا کے غریب عوام کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ان کا دیرینہ خواب تھا۔ ان کے نزدیک آسودہ حال لوگوں کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ عوام کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اپنے راستے چلتے رہیں اور ایک مخصوص حلقے میں پُرتعیّش زندگی بسر کرتے رہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، ان کو اپنی پارٹی کی رومانوی بہادری کے اصولوں پر پورا اعتماد نہیں تھا، اس لیے کہ وہ کبھی بے لچک اور کٹّر کارکن نہیں تھے، ورنہ وہ باآسانی سے 'ماسکو کے مذہب' کے ایک کامیاب 'مُلّا' کبھی کے بن چکے ہوتے۔

میں بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید سبطِ حسن سیاست کے اس کھیل کے لیے موزوں نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پارٹی کے لیے اتنی طویل خدمات کے باوجود، اپنی تمام عمر میں صرف ایک بار 'حجِ ماسکو' کے لیے بلائے گئے تھے اگر چہ بہت سے لوگوں کی بارہا ایسی 'عزت افزائی' ہوئی تھی۔ یہ افتخار ان کی زندگی بھر کا سرمایہ تھا اور وہ بھی عمر کے آخری دنوں میں انھیں بخشا گیا تھا۔ اب ہم پلٹ کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عزت افزائی نہ ہی ہوئی ہوتی تو شاید بہتر ہوتا۔

سید سبطِ حسن کو اپنے ایقان اور توقعات کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ لام پر بھیجے جانے والے، یا جنگ کے دوران غائب تصور کیے جانے والے پیشہ ور فوجیوں کی طرح ان کو بھی اپنے اقربا سے طویل عرصے کی دوری برداشت کرنی پڑی تھی۔ ان کی بیٹی صرف پانچ برس کی تھی جب وہ امریکا گئے تھے۔ نوشابہ کہتی ہیں کہ ''جب وہ امریکا گئے تھے تو ہم اور ہماری والدہ چچاجان کے پاس ڈھاکے اور چاٹگام میں مقیم رہے۔ انھوں نے ہندوستان میں مقیم میرے دادا سے درخواست کی تھی کہ ان کے حصے کی جائیداد میرے نام کردی جائے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کم از کم میرے تعلیم کے خراجات ادا ہوتے رہیں گے۔ اور جب وہ امریکا سے واپس آئیں گے تو وہ میرے اور میری والدہ کے اخراجات اٹھانے کے قابل ہوں گے۔ آپ نے دیکھا کہ چوں کہ وہ پارٹی کے لیے کل وقت کام کررہے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور میں اور میری والدہ اپنے آبائی گاؤں میں اس لیے مقیم نہیں رہ سکتے تھے کہ وہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ والدہ کہتی تھیں کہ ان کو اعزّہ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے اس لیے کہ میں ان کی واحد اولاد تھی اور انھوں نے اپنے شوہر سے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ کو باقاعدہ تعلیم دلوائیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگ مشرقی پاکستان منتقل ہوگئے تھے اور میری والدہ نے مجھے اس وقت کے بہترین اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ ہماری ساری جائیداد ضبط ہوگئی اور میرے دادا ہماری کفالت کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ وہ یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کو باقاعدہ تعلیم دی جانی چاہیے۔ مگر ہمارے چچا نے ہماری مدد کی۔ میں ان کی اور اپنی والدہ کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے اس کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا تھا۔''

یہ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے کہ سبطِ حسن مشہور راولپنڈی سازش مقدمے میں ملوث ہونے کے الزام میں قید کردیے گئے۔ ان کو سزا نہیں ہوئی تھی۔ ان پر کچھ گھڑے ہوئے الزامات تھے جن کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا تھا۔ اربابِ اقتدار نے ان کو چار برس تک لاہور جیل میں قید رکھا۔ الزام ثابت نہ ہونے پر انھیں رہا تو کردیا گیا مگر ان کی سخت نگرانی کی جاتی رہی۔ کچھ دنوں تک وہ مختلف اشاعتی اداروں میں معمولی قسم

کے کام کرتے رہے، جو کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں حکومت تک ان کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں، اور وہ تیار رہتے تھے کہ کسی وقت بھی ان کا سرکاری مہمان خانے میں جانا ہوسکتا ہے۔ انھوں نے جیل میں کاٹے ہوئے عرصے کی بابت مجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ مگر جب بھی حکومت تبدیل ہوتی تو وہ اپنے اہلِ خانہ اور خاندان سے کہتے تھے کہ ''میں اپنے سرہانے خشک دودھ اور چائے کی پتی تیار رکھتا ہوں، مبادا مجھے اچانک جیل جانا پڑ جائے تو کم از کم یہ دو اشیا تو میرے پاس ہوں۔'' لاہور جیل میں ان کو بیشتر قیدِ تنہائی میں رکھا جاتا تھا۔ بس اسی قدر بات انھوں نے اپنے قریب ترین دوستوں کو بتائی تھی، اور جیل میں اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں یہ کہ جب وہ یہ سوچتے تھے کہ 'میں کس مشکل میں ہوں، واقعی اب میری موت قریب ہے۔' ان کے آس پاس کے لوگ تشدد سے ادھ موئے کر دیے جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے وقت میں وہ سوچتے رہے ہوں گے یہ سب کس لیے ہو رہا ہے، اور کیوں؟ مگر انھوں نے مجھ سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی، نہ ہی اپنے کسے ساتھی سے۔

۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سبطِ حسن ایک بار پھر، بغیر کسی الزام اور مقدمے کے بغیر ایک بار پھر جیل بھیج کر خاموش کر دیے گئے۔ اس وقت تک، ۱۹۵۵ء میں ان کی رہائی کے بعد، ان کی اہلیہ اور بیٹی مشرقی پاکستان چھوڑ کر ان سے آ ملے تھے۔

''میں اس وقت کالج میں پڑھ رہی تھی جب ان کو دوبارہ قید کر لیا گیا۔ خفیہ پولیس کے چیف کی بیٹی میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کو ایک دن قبل ہی یہ اطلاع مل گئی تھی، جس کا ذکر اس نے بعد میں مجھ سے کیا تھا۔ وہ میرے خطوط اپنے والد کے ذریعے پہنچوا دیتی تھی اور اپنے والد سے میرے والد کی جلد رہائی کی درخواست بھی کرتی رہتی تھی۔ اس دنوں تمام لوگ میرے اور میرے والد کے ساتھ ہم دردی ظاہر کرتے تھے۔ میں آزادی سے اپنے والد کو خط لکھ سکتی تھی۔ چوں کہ میرے والد اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے قید میں تھے اس لیے مجھے ایک ہیروئن کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ برسوں بعد جب میری شادی ہوئی تو اُن صاحب نے، جو کبھی سیکریٹری داخلہ اور خفیہ کے چیف تھے، اپنے ایک خط میں میرے والد سے اظہارِ معذرت کیا تھا کہ مجھے آپ کے خلاف بہت کچھ کرنا پڑتا تھا مگر یہ میری مجبوری تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ میں آپ اور آپ کی بیٹی کے لیے روئے زمین پر موجود تمام خوشیوں کی تمنا کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنا شرم سے جھکا ہوا سر کبھی نہیں اُٹھا سکیں گے۔ مگر وہ تو صرف ایک حکومتی کارندے تھے جو حالات کو بدل نہیں سکتے تھے۔ مگر اب، جب کہ وہ ملازمت سے فارغ ہو چکے ہیں اور آزادی سے بات کرتے ہیں، اس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔''

ایوب خان کی حکومت نے ان کو دو برس تک نظر بند رکھنے کے بعد ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ نوشابہ کہتی ہیں، ''کئی برس بعد وہ اتنے خوش ہوئے تھے اس لیے کہ لاہور کے ایک بہت مشہور ہفتہ وار رسالے 'لیل و نہار' کے مدیر بنا دیے گئے تھے۔ انھیں یہ کام بہت پسند تھا۔ وہ اس میں اس وقت تک رہے جب حکومت نے 'پرگریسیو پیپرز' کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، جو ''لیل و نہار'' کا مالک ادارہ تھا۔ یہ ایک لاجواب رسالہ تھا۔ اب تک پاکستان ایسا رسالہ جاری نہیں کر سکا ہے۔ یہ بالکل TIME میگزین جیسا تھا اور اس کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مگر پھر اس رسالے کو ضبط کر لیا گیا اور میرے والد کو اس وقت تک چھوٹے موٹے کام کرنے پڑے جب تک کہ ان کے دوست روشن علی بھیم جی نے انھیں اپنے ادارے ایسٹرن فیڈرل انشورنس میں ملازمت فراہم نہیں کر دی تھی۔''

روشن علی بھیم جی ان کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی میں سبطِ حسن سے زیادہ قریب کوئی اور دوست نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے دونوں کے نظریات میں وسیع اختلافات رہے ہوں گے مگر ذہنی اور جذباتی سطح پر ان میں یکسانیت تھی۔ نوشابہ زبیری نے بتایا کہ یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے زندگی بھر کے دوست بن گئے۔

''میرے والد لکھنؤ میں رہتے تھے۔ وہ مشہور انگریزی اخبار پانیئر کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن ان کے ایک دوست رشید صاحب نے

فون پر بتایا کہ روشن علی بھیم جی نام کے ایک صاحب جو جاپانیوں کی بمباری کے باعث اپنا سب کچھ کھو کر، رنگون سے فرار ہو کر، حال ہی میں ہندوستان پہنچے ہیں، لکھنؤ آنے والے ہیں۔انھوں نے میرے والد سے درخواست کی کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے انھیں لے آئیں اور ان کا خیال رکھیں۔ میرے والد ان سے ملنے ریلوے اسٹیشن گئے۔ اس وقت روشن علی بھیم جی کی جیب میں صرف دو روپے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ روشن علی اب بہت بڑے آدمی ہیں مگر وہ آج بھی اسی طرح پیش آتے ہیں جیسے کہ اب بھی ان کی جیب میں صرف دو روپے ہوں، اتنے منکسر المزاج انسان ہیں وہ،انھوں نے آج تک کبھی دولت کے بارے میں بات نہیں کی ہے۔ میرے والد کی بات ہمیشہ اس جملے پر ختم ہوتی تھی کہ ان کے اور بھیم جی کے درمیان تعلقات آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ اس دن تھے جب ریلوے اسٹیشن پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ان کی جیب میں صرف دو روپے تھے۔ اور یہی احساسات تھے جن کی بنا پر ان کی دوستی اس وقت تک قائم رہی جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔''

زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ، ملک کے غریب لوگوں کے بارے میں ان کی فکر، شاعری سے ان کا شغف اور، غیر مذہبی سیاست کا جنون ان کی دوستی کی بنیادیں تھیں۔

میں اس وقت ای ایف یو ہی میں کام کر رہا تھا جب بھیم جی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ ہماری کمپنی میں، جو اب ایک بڑا مالیاتی ادارہ بن چکی تھی، سبطِ حسن کو ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم رکھنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔بھیم جی صاحب کے گھر پر اکثر سبطِ حسن سے میری ملاقاتیں ہوتی تھیں اور میں ان کے بارے میں بہت سُن چکا تھا۔ای ایف یو کو اپنی تعلقاتِ عامّہ کے لیے بڑے پیمانے پر اقدامات کی ضرورت ہوگئی تھی۔ جناب تھاور (Thaver) کی صورت میں کمپنی کو اس کام کے لیے ایک مستعد شخصیت کی معاونت حاصل تھی۔ اس وقت تک ای ایف یو ایک گھریلو نام بن چکا تھا اور اس کو نئے ساحل اور نئے افق کی تلاش تھی۔مگر ضروری یہ تھا کہ کمپنی ہی میں کوئی ایسی شخصیت ہو جو کمپنی کی اپنی پیداوار بن سکے اور جناب تھاور کی طرح نہ صرف لوگوں کی رہنمائی کر سکے بلکہ ان میں ایسے جذبات ابھار سکے جو ملک کے عام لوگوں میں کمپنی کا امیج بڑھانے میں مدد دے سکیں۔ تو کیا سبطِ حسن جیسا فلسفی ادیب، دن کی روشنی میں خواب دیکھنے والا اس کام کے لیے موزوں تھا یا نہیں؟ اس کا جواب تو اس وقت مل سکتا تھا جب ان کو اس کام پر لگا کر تجربہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے ایسے انسان کی ضرورت تھی جو روشن علی بھیم جیسی دوررس نگاہ اور اس پر عمل کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہو۔ شاید بھیم جی خود خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ یہ کوشش اتنی کامیاب ہوگی۔

۱۹۸۲ء میں منائی جانے والی ای ایف یو کی گولڈن جوبلی میں اپنی تقریر میں اپنے دوست کو اس مرتبے پر فائض کرنے کے بارے میں بھیم جی کے الفاظ تھے، ''صدی کے چھٹے عشرے میں انشورنس کمپنیوں نے تشہیر پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ ہمارے پاس ایک معمولی سا بجٹ ہوتا تھا جس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی شعبہ نہیں تھا۔ ہم نے اس کام کے لیے ایک مناسب شخصیت کی تلاش شروع کی تو ہماری نظر سید سبطِ حسن پر پڑی۔ پہلے تو انھوں نے یہ کہہ کر جواب دے دیا تھا کہ انھیں تشہیر کا کوئی تجربہ نہیں، وہ صرف ایک صحافی اور ادیب تھے۔ ہمیں یہ کام ان پر زبردستی لادنے میں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ای ایف یو کو ٹیلی وژن پر تشہیر کا تین بار انعام دیا گیا۔ یہ سبطِ حسن ہی تھے جنھوں نے 'ای ایف یو۔ عافیت کا نشان' جیسا نعرہ ایجاد کیا تھا جو گھر گھر مشہور ہوا، جو زندگی کے بیمے کے معنیٰ کا قریب ترین ترجمہ تھا: اگر آپ کو تابناک اور اچھا مستقبل درکار ہے تو آپ کو ای ایف یو کی ضرورت ہے۔

سید سبطِ حسن کا ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے تقرر کمپنی کی خوش قسمتی تھی۔ صحافی کی حیثیت سے سبطِ حسن کے کبھی نہ ختم ہونے والے تجربے اور ان کے علم کی دولت سے ای ایف یو کو بہت فائدہ ہوا۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک باکمال دانشور جانا ہے، جو نہ کبھی افسردہ ہوتا تھا، جس کے پاس دل چسپ کہانیوں اور عمدہ لطیفوں کا خزانہ ہوتا تھا، ہمیشہ مدد کے لیے مستعد، ایک ہاتھ میں پائپ شاید جس سے

نکلنے والے دھویں سے نئے نئے خیالات اور منصوبوں کے چشمے پھوٹتے تھے۔ اپنی مخصوص نظریاتی وابستگیوں کے باوجود ہر حلقے میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

سبطِ حسن اور میں، ایک منزل پر، قمر ہاؤس میں پڑوسی بھی تھے اور اچھے دوست بھی۔ اگر چہ ان کے مقابلے میں میری عمر بہت کم تھی، میں ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھا، پھر بھی کبھی کبھی سیاست کے وسیع میدان میں ہم اتفاق بھی کرتے تھے۔ میرا تعلق ایسے ملک سے تھا جو کمیونسٹ اثرات کے حلقے سے بہت قریب تھا اور آمرانہ حکومت کے بارے میں میرے تجربے ان سے مباحثے میں بہت کام آتے تھے۔ انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا مگر مجھے احساس تھا کہ کبھی کبھی ان کے دل میں شبہات سر ابھارتے تھے مگر شاید کسی خاص تبدیلی کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی۔

سبطِ حسن کو جب ماسکو آنے کا دعوت نامہ ملا تھا، میں پاکستان چھوڑ چکا تھا۔ بھیم جی نے مجھے اس بارے میں لکھا تھا اور تجویز پیش کی تھی کہ ماسکو سے واپسی پر سبطِ حسن کو نہ صرف انگلستان بلکہ میونخ بھی جانا چاہیے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا مگر مجھے اس بات پر بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ماسکو کے آہنی پردے کے پیچھے سے آنے والے کسی دوستانہ اشارے کی وجہ سے میونخ نہیں گئے۔ شاید اس لیے کہ ۱۹۶۸ء میں، جب وہ ماسکو گئے تھے، جرمنی کا مغربی حصہ 'سرد جنگ' کا مرکز بنا ہوا تھا۔

سبطِ حسن کی بیٹی کے مطابق، سوویت یونین کی اپنی پہلی اور آخری یاترا کے بعد، جس کی ان کو ہمیشہ خواہش رہی ہو گی، انھوں نے کچھ زیادہ بات نہیں کی تھی۔ ''ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ واپسی پر انھوں نے کوئی زیادہ بات نہیں کی۔ انھوں نے سوویت یونین پر نکتہ چینی بھی نہیں کی تھی مگر ہمیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہاں کے حالات بہت اچھے بھی نہیں تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ خوش نہیں تھے اور انھیں وہاں دوبارہ جانے کی کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ بڑے تنقیدی دماغ کے مالک تھے اور ماسکو والے اس بات کو جانتے رہے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اتنے دنوں تک وہ ان کو نظر انداز کرتے رہے۔ سبطِ حسن کسی سے بھی ناانصافی کے سخت خلاف تھے۔ انھیں اپنے نظریات پر پورا اعتماد تھا اور وہ سچ مچ اس بات کے قائل تھے کہ کمیونزم ہی دنیا کی نجات کا باعث ہو گی۔ وہ کسی بھی صورت میں طاقت کے استعمال کو بُرا سمجھتے تھے۔ سوویت یونین سے واپسی پر ان میں تبدیلی آ گئی تھی، وہ بہت پُرسکون ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے خاموش رہنا ہی پسند کیا تھا۔ میرے خیال میں انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر انھوں نے بولنا شروع کیا تو انھیں اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنا پڑے گا، اس لیے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ وہ ہمیشہ وہی کہتے تھے، ان کی نظر میں جو صحیح ہوتا تھا۔ انھیں خراب نتائج کی کبھی پروا نہیں رہی۔ اور شاید ان کی زندگی کا یہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔''

سید سبطِ حسن کمیونسٹ سلطنت کا زوال دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔ وہ ستر برس پرانا 'آہنی پردہ' اُٹھنے اور کمیونزم کے زوال سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ''یہ پہلا موقع تھا جب میں واقعی خوش تھی کہ وہ زندہ نہیں تھے۔ ان دنوں ہم لوگ ملک سے باہر تھے اور برلن، بوڈاپسٹ، بخاریسٹ، وارسا اور دوسرے مقامات پر جو کچھ ہو رہا تھا ٹیلی وژن پر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے سارا ڈھانچا سب نرم گودے سے بنی ہوئی عمارت کی طرح ڈھیتے دیکھا۔ میرے شوہر نے کہا تھا، کیا تم خوش نہیں ہو کہ ڈیڈی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں؟ تم نے دیکھا، یہ سب ایک خواب تھا۔ کم از کم اب تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب تھا۔''

سید سبطِ حسن کا انتقال ہندوستان میں ۱۹۸۷ء میں، دلّی میں ہوا۔ وہ اُس سال دلّی میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات کے منتظمین میں سے ایک تھے۔ انھوں نے کراچی میں ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے بہت محنت کی تھی۔ نوشابہ کہتی ہیں، ''وہاں کئی لوگ ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ وہ کسی کو اہم ذمے داری سونپنے کے معاملے میں اچھے نہیں تھے۔ انھوں نے سب کچھ خود کرنا چاہا تھا۔ وہ بہت کم زوری محسوس کر رہے تھے، اس قدر کہ انھوں نے ڈاکٹر مانجی سے مشورہ بھی کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ انھیں تامل تھا مگر انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دلّی نہیں جائیں گے۔ مگر آخر وقت میں انھوں نے اپنا ارادہ اس لیے بدل دیا کہ ماسکو سے احکامات ملے تھے کہ دلّی میں ان کی موجودگی ضروری تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا، 'میں ایک کمیونسٹ کارکن ہوں اور میں پارٹی کا حکم بجالاؤں گا' اور دلّی چلے گئے۔ کانفرنس کے بعد وہ ذاتی حیثیت میں لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں سے ان کی بہت سی جذباتی یادیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا تھا کہ 'میں نہیں سمجھتا کہ یہاں آجانے کے بعد میں کبھی پاکستان زندہ جاسکوں گا۔'

وہ دلّی واپس گئے اور ان کو دل کا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جاں بر نہیں ہو سکے۔ ان کا جسدِ خاکی کراچی لایا گیا جہاں ان کی تدفین ہوئی۔ ان کی موت پر ہر طرف سے تعزیت کی گئی، جس میں سیاسی جماعتیں اور ممالک کے سربراہ بھی شامل تھے۔

(یہ واقعہ دراصل اپریل ۱۹۸۶ء کا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کا جلسہ دلّی میں نہیں، سجاد ظہیر کے آبائی شہر لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ راقم خود اس جلسے میں موجود تھا، جب سبطِ حسن پاکستان سے آنے والے وفد کے صدر تھے اور ڈائس پر جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے بوسکی کا کُرتہ اور سفید لٹھے کی شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ لکھنؤ کے جلسے کے بعد سبطِ حسن اپنے کامریڈ ساتھی ضیاء الحق سے ملنے الہ آباد گئے تھے۔ واپسی کے وقت پاکستان سے آنے والے وفد کے استقبال کے اعزاز میں غالب اکادمی دلّی میں ایک جلسہ معین تھا مگر اسی دن صبح سبطِ حسن کو دل کا دورہ پڑا، وہ ابوالکلام اسپتال میں داخل ہو کر انتقال کر گئے اور غالب اکادمی کا استقبالیہ جلسہ سبطِ حسن کے لیے تعزیتی جلسے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مترجم)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سربرآوردہ رُکن، سبطِ حسن اردو کے بہترین ادیبوں میں سے تھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئی تھیں اور آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ ریاستی لادینیت اور مسلم اُمّہ اور بالخصوص پاکستان کے تناظر میں ملّائیت ان کے محبوب موضوعات میں سے تھے۔ ان کی کتابیں بہت سے فلسفیانہ، تہذیبی اور تاریخی موضوعات کا احاطہ بھی کرتی ہیں۔ ایک زیرِ تصنیف کتاب جو ان کی موت کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکی، ان کے بہت قریبی دوست اور اردو کے بہت بڑے شاعر فیض احمد فیض کے بارے میں تھی جو انھوں نے فیض کی موت کے بعد لکھنی شروع کی تھی۔ اس کتاب میں وہ فیض کی نظموں کے تہذیبی اور سیاسی پس منظر کی تلاش میں تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب بڑی ادبی اہمیت کی حامل ہے اس لیے کہ ان کے علاوہ علی گڑھ کے دنوں سے شاید ہی کوئی ان سے زیادہ فیض سے قریب رہا ہوگا۔

سبطِ حسن اب اپنی تحریروں میں اور اس کردار میں زندہ ہیں جو انھوں نے ایسٹرن فیڈرل کے تعلقاتِ عامّہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کمپنی کو عوام میں مقبول بنانے میں ادا کیا تھا۔

ایس ایف عالم اپنے چیئرمین روشن علی بھیم جی کے ہمراہ

روشن علی بھیم جی، ایس ایف عالم اور آغا ناصر علی یونائیٹڈ بینک سے گروپ انشورنس کے معاہدے پر مسرور، یو بی ایل کے مندراوالا بھی مطمئن نظر آرہے ہیں

ایس ایف عالم

ایک بے عیب اور معتبر انسان

شاہ فیاض عالم ایک خاموش طبع، سادہ مزاج مگر بہت غیر معمولی انسان تھے۔ ان کا مضبوط کردار اور مستعد ذہن ان کی حلیم الطبعی اور منکسر المزاجی کے بالکل برعکس تھا اور یہی ان کی مخصوص پہچان تھی، کم از کم ان لوگوں کے لیے جنھیں ان کی قربت میسر تھی۔ جب ۱۹۶۰ء میں میری ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے اپنی شکل وصورت، اپنے نرم خو اور فیصلہ کن اندازِ گفتگو، تصورات اور شریفانہ مزاج سے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں طویل ترین عرصے سے منسلک افسران میں سے ایک تھے۔

وہ ۱۹۱۸ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ سے بیچلر آف آرٹس اینڈ لا فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ کھیل کود میں اور سماجی مصروفیتوں میں بہت فعّال تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، سر شاہ سلیمان نے ایک بار ان کو اپنی تعلیمی کوششوں پر اعزاز سے نوازا تھا۔

گریجویشن کے بعد انھوں نے وکالت شروع کر دی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل ۱۹۴۵ء میں ای ایف یو میں شامل ہوئے اور جلد ہی کمپنی کی کانپور شاخ میں برانچ منیجر ہو گئے۔ وہ کمپنی کے لائف اور جنرل کاروبار دونوں کے اس وقت تک ذمّے دار رہے جب ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کی حکومت نے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ چوں کہ کمپنی کو جنرل بیمے کے کاروبار کے لیے ایک کُل وقتی نگہبان کی ضرورت نہ تھی اس لیے عالم صاحب کا کراچی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں بہ حیثیت اسسٹنٹ منیجر تبادلہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد کئی برس کے دل چسپ عرصے میں جو کچھ ہوا وہ عالم صاحب کے لیے مشکل مگر ذاتی طمانیت کا باعث بھی تھا۔ عالم صاحب نے صدی کے چھٹے عشرے میں کمپنی کے کاروبار کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں ان کو لاہور میں زونل منیجر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ان کی اعلیٰ کارگزاری کو ۱۹۶۴ء کی کمپنی کی سالانہ رپورٹ میں بطورِ خاص سراہا گیا تھا۔ بالآخر ان کو لائف انشورنس کے جنرل منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور وہ ملک میں لائف انشورنس کے ایک اہم پیشہ ور افسر کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ محمد حسین علوی، شرافت علی والا جاہی اور کمپنی کے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر تاج الدین مانجی کی ہمراہی میں عالم صاحب، کمپنی کے سربراہ مسٹر بھیم جی دستِ راست سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ جب ۱۹۷۲ء میں پاکستان کی بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا عالم صاحب امریکن لائف انشورنس کمپنی کے ٹرسٹی مقرر کیے گئے تھے۔

اور یہ بھی کچھ حیرت کی بات نہیں تھی جب ۱۹۷۵ء میں مسٹر بھیم جی نے آغا حسن عابدی صاحب کے لکسمبرگ میں قائم شدہ بینک کی مدد سے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی دبئی میں بنیاد ڈالی تو عالم صاحب کو لائف ڈپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ نے فروری ۱۹۷۹ء میں اپنا کاروبار شروع کیا تھا اور عالم صاحب نے ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت

سے اس کا انتظام سنبھالا تھا۔ یہ ایک نہایت دل چسپ مگر مشکل ذمّے داری تھی۔ یا عالم صاحب کے بہت قریبی رفیق جناب ایس اے نقوی کے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''کسی کمپنی کے لیے ایک نئے ملک میں جہاں یہ کاروبار پہلی بار کیا جا رہا ہو اور جہاں ملک ملک کے باشندے مقیم ہوں، بہت دقت طلب اور ایک بہت پیچیدہ کاروبار تھا۔ ایک اندازے کی مطابق دبئ میں ۵۸ رقومیتوں کے باشندے اپنی تمام تر مخصوص ضرورتوں، سماجی اور معاشی پیچیدگیوں کے ساتھ صرف دولت کمانے کے لیے اکٹھے ہوگئے تھے۔ جہاں ہر شخص صرف 'آج' کے لیے سوچتا ہو جب کہ بیمۂ زندگی 'کل' کی ضروریات کو پورا کرتا ہے وہاں زندگی کے بیمے کی فروخت کا کاروبار ایک کارِ دُشوار تھا۔''

تعجب نہیں کہ عالم صاحب جیسی لیاقت اور منجھی ہوئی کاروباری صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے نئی سرزمین پر نئی کمپنی بہت جلد ایک طاقت بن کر ابھری۔ ان کی ذاتی دیانت، معیاری درجے کی وفاداری، فسوں کار اور دوستانہ شخصیت نے انھیں ایک قابلِ اعتماد اور ساتھیوں کے بین پسندیدہ افسر بنا دیا تھا۔ جناب بھیم جی اور ان کے دوسرے ساتھیوں، دبئ کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر امیر علی مولیدینا اور ای ایف یو جنرل کے موجودہ منیجنگ ڈائریکٹر سیف الدین زومکاوالا سمیت سبھی عالم صاحب کا احترام کرتے تھے۔

سیف الدین زومکاوالا کہتے ہیں کہ ''وہ بہت نفیس انسان تھے۔ بڑے منجھے ہوئے اور خوش پوش، اور زندگی کے ہر پہلو سے ایک اچھے آدمی تھے۔ مجھے دبئ میں اپنے ابتدائی دنوں کا ایک واقعہ یاد ہے جب ہم سب ایک 'ایئر لائنز ہوٹل' میں مقیم تھے جس کی جگہ اب ایک نیا ہوٹل تعمیر ہو چکا ہے۔ ایک صبح مجھے ساڑھے چار بجے ایک مہمان کو لینے کے لیے ہوائی اڈے جانا تھا۔ اس ہوٹل کی لابی ایک مستطیل ہال کمرے پر مشتمل تھی جہاں مجھے عالم صاحب نظر آئے۔ وہ ایک لانبی قمیص اور پاجامے میں ملبوس ٹہل رہے تھے۔ وہ بالکل خاموش چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں ان کو اتنے سویرے اس حال میں دیکھ کر متفکر ہوگیا کہ انھیں کوئی پریشانی تو لاحق نہیں۔ میں نے بڑھ کر ان سے پوچھا 'سر! خیریت تو ہے؟ وہ مسکرائے اور بولے آپ فکر نہ کیجیے، میں ہر صبح اسی طرح ٹہلتا ہوں، اسی وقت میرے ذہن میں اچھے خیالات آتے ہیں'۔

ان کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ انھیں خریداری بہت پسند تھی، اس میں انھیں بہت لُطف آتا تھا۔ اس بابت معلومات حاصل کرنے کے لیے ان سے بہتر کوئی نہیں تھا جو آپ کو بتا سکے کہ کس دکان میں کون سی شے، کس معیار کی اور کس قیمت پر مل سکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ کمپیوٹر کی طرح تھے۔ اور ہم سب کی طرح وہ بھی لائف ڈپارٹمنٹ کو بہترین انداز میں چلا رہے تھے۔ ان کے اور امیر علی مولیدینا کے بین ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ ایک جنرل کا اور دوسرا لائف کا چیف ایگزیکٹیو تھا، دونوں نفیس انسان تھے اور اگرچہ وہ دونوں اپنے اپنے معاملات میں آزاد تھے مگر ان کے درمیان ایک طرح کی ہم آہنگی تھی کہ دونوں بازو اس طرح چلائے جائیں کہ ایک ہی جیسے معلوم ہوں۔ بلاشبہ دونوں شعبے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ ایک ہی شعبے کی طرح کام کر رہے تھے۔''

اٹھائیس نومبر ۱۹۸۵ء کو ۶۷ ربرس کی عمر میں اچانک ان کے انتقال سے ای ایف یو گروپ کو بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔ ان کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے خالق سے جا ملے تھے۔

ان کے رفیقِ کار امیر علی مولیدینا نے مجھے ٹیلی فون پر یہ افسوس ناک خبر سنائی۔ مجھے بھی بہت دُکھ ہوا تھا اس لیے کہ میں ہمیشہ ان کو پرانی اور نئی ایسٹرن فیڈرل کے درمیان ایک پُل کے مانند سمجھتا تھا، تقسیم سے قبل یعنی ٹام ہیکسٹر اور خوندکر فضلِ حیدر کے زمانے کی ایسٹرن فیڈرل اور بین اور نئی ایسٹرن فیڈرل جو روشن علی بھیم جی کے زیرِ انتظام ابھری تھی۔ عالم صاحب نے کمپنی میں کامیابی سے نئی روح پھونکنے کے عمل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پرانے کشتی بانوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ اختیار کردہ نئی راہ ہم کو نئے آفاق کی طرف لے جائے گی۔

جیسا کہ مسٹر ایس اے نقوی نے کہا تھا، ''عالم صاحب ایک حرکی، راست، منظم اور اختراعی خصوصیات کے حامل تھے اور مشکلوں سے مقابلہ کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ دراصل ان کی زندگی غیر معمولی کامیابیوں کی داستان تھی اور وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان تھے۔''

جناب شرافت علی والاجاہی (اندازاً ۱۹۷۵)

شرافت علی والا جاہی

ہمیشہ ایک قدم آگے

وہ اس وقت وہاں موجود تھے جب میں نے اپنی زندگی کے یادگار سال ای ایف یو میں شروع کیے تھے، اس وقت بھی جب کمپنی لندن میں ہونے والے واقعات کے بھنور میں تھی، اس وقت وہ اپنے پیشے کی فنی علامت بن کر ابھرے تھے جب سیاست اور کاروبار کو عوام کے نام پر گڈ مڈ کر دیا گیا تھا، جنھوں نے نہ توقع کی تھی نہ ہی وہ کچھ مانگا تھا جو اقتدار نے مناسب سمجھا تھا: بیمے کی صنعت کا قومی ملکیت میں لیا جانا۔ اور بلاشبہ انھوں نے میری رہنمائی کی تھی جب میں کمپنی اور اس ملک کے ابتدائی دنوں میں ماضی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ میرے گرو اِروِن آئیون نے جرمنی سے چلنے سے قبل مجھے ان کا نام لے کر ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ای ایف یو کے لیے صحیح راستہ تلاش کرنے میں اور نئے ملک کے اندازِ زندگی کو سمجھنے میں یہ میرے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرا دوست، اور باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی درست نکلا، اور جس آدمی کا نام اس نے مجھے بتایا تھا وہ میرا دوست بن گیا، اس کا نام شرافت والا جاہی ہے۔

وہ اپنے اعلیٰ درجے کے تعلیمی اور خاندانی پس منظر کے اعتبار سے کمپنی کے ابھرتے ہوئے افسران میں سے ایک تھے۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے مگر اُن کی تعلیمی اسناد میں پیدائش کا مہینہ ستمبر درج ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ لاہور سے میٹرک کا امتحان دینا چاہ رہے تھے تو ان کی عمر کم سے کم سے عمر سے دو ماہ کم تھی۔ لہٰذا ان کے بڑے بھائی نے جو انھیں لے کر لاہور گئے ہوئے تھے، ان کی تاریخِ پیدائش میں تبدیلی کر دی تھی، جس سے بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

وہ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پردادا The Prince of Arcot ریاست کے حاکم تھے۔ ان کا نام محمد علی والا جاہ تھا اور میسور کے سلطان ٹیپو اور نظام حیدر آباد کے ہم عصر تھے۔، نظام حیدر آباد ہندوستان کی ریاست کے واحد حکمراں تھے جو His Exalted Highness کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ میرے دوست شرافت کے مطابق برطانوی دور میں جنوبی ہندوستان میں صرف یہ تین ریاستیں تھیں۔ اس کتاب کے سلسلے میں میری ملاقات شرافت سے متحدہ عرب امارات کی ریاست عجمان میں ان کے خوب صورت دفتر میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی ایک ٹیکسٹائل فیکٹری چلا رہے ہیں۔ ان کے والد نواب نوراللہ والا جاہی مدراس سے حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے اور وہیں شرافت کی ولادت ہوئی اور انھوں نے تعلیم پائی۔ وہ ایک ہونہار شاگرد تھے، ہمیشہ دوسروں سے ایک قدم آگے۔ ان کی عمر صرف برس کی تھی جب انھوں نے براہِ راست میٹرک کے امتحان میں بیٹھنا چاہا تھا۔ اگر وہ اسکول کی معرفت جاتے تو ایک برس اور انتظار کرنا پڑتا۔ ایک سال قبل ہی میٹرک کر لینے کا یہی راستہ تھا کہ وہ پنجاب بورڈ سے امتحان میں بیٹھتے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ان کی تاریخِ پیدائش میں ردو بدل کیا گیا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے 'چندر گھاٹ' کالج میں داخلہ لے لیا اور اپنے شہر کی عثمانیہ یونی ورسٹی سے معاشیات اور سیاسیات میں گریجویشن کیا۔

اس یونی ورسٹی کی اپنی خصوصیت رہی ہوگی اس لیے کہ اس کو حضور نظام سابع میر عثمان علی خان کا ایک اپنی ریاست کے تعلیمی شعبے کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ اور اردو زبان کے لیے، یادگار تحفہ کہا جاتا ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھی جہاں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تھا اور یہ اس زمانے میں ایک متنازعہ فیصلہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے نہایت متنازعہ تھا اور یاد رہے کہ آرٹس کالج کی جگمگاتی ہوئی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے خود نظام نے اس بات کو دُہرایا تھا۔ وہ عمارت ترکی، ایرانی اور دکن طرزِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔

نظام نے فرمایا تھا، ''اردو زبان کی طرح یہ عمارت بھی حیدرآباد میں مقیم مختلف نسل کے لوگوں کے اندازِ زندگی اور ان کی تہذیبوں اور تمدّن کی آئینہ دار ہے۔ یہ عمارت اس باہمی دوستی کا بھی خوش نما نمونہ ہے جو میری ریاست میں صدیوں سے بسنے والی رعایا کے درمیان قائم ہے اور میں اسے مزید قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ شرافت والا جاہی نظام کے آزاد رو اور دور رس اندازِ حکمرانی سے بہت متاثر تھے۔ بچپن ہی سے انھیں ہر اس علم کو حاصل کرنے کا جنون تھا جس میں انھیں دل چسپی ہوتی۔ زندگی کی ابتدا ہی سے ان کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ان کا عزم ان کے اعمال پر حاوی رہا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعے ہوئی تھی مگر جلد ہی انھوں نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ وہ اپنے ذاتی خرچ سے انگریزی زبان کے تمام اخبارات منگواتے، جس میں ٹائمز آف انڈیا بھی شامل تھا۔ اخباروں سے وہ نوٹ بناتے، جو جملے انھیں بھاتے کاغذ پر نقل کرتے اور ان کو یاد کرنے کی کوشش کرتے۔

سیاست کے تمام معاملات میں شرافت کی ابتدائی دل چسپیاں انھیں والد سے ورثے میں ملی ہوں گی جو ایک زمانے میں ریاست حیدرآباد کے مرکزی سیاسی ادارے کے خازن رہ چکے تھے۔ اگر چہ وہ ایک قسم کی مقامی پارٹی تھی مگر اس کی سیاست ہندوستان کے طول وعرض میں تھی اور اس کے رہنما ہندوستان کی تاریخ کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ وہ بہت معروف نہیں تھے اس لیے کہ وہ نوابی سے سیاست کی طرف راغب ہوئے تھے مگر خطابت کی اعلیٰ صلاحیت کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ ان کا نام بہادر یار جنگ تھا، اور وہ صدر تھے ایک بڑی پارٹی کے جس کا نام تھا مجلس اتحاد المسلمین۔ وہ حیدرآباد کے، مگر دراصل مسلم امّہ کے رہنماؤں میں سے، پٹھان شرفا کی نسل سے تھے۔ قدرت نے انھیں بہت نعمتوں سے نوازا تھا جن کی شخصیت سے نوجوان والا جاہی نے کسبِ فیض کیا ہوگا۔ بہادر یار جنگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے شرافت والا جاہی نے کہا، ''وہ لاکھوں کے مجمع کو اپنی تقریر کے وقت پوری رات جمع رکھ سکتے تھے۔ اس بات کا میں خود گواہ ہوں کہ لوگ (ان کو سننے کے لیے) آٹھ بجے شام کو آتے اور دوسری صبح آٹھ بجے گھر واپس جاتے تھے۔ اور اسٹیج پر ان کے سوا کوئی اور شخص نہیں ہوتا تھا۔ نظام ان کا بہت احترام کرتے تھے اور جناح صاحب ان کو چاہتے بھی تھے اور مشورے بھی دیتے تھے۔

بڑے مقررین نے ہمیشہ شرافت والا جاہی کو مسحور کیا ہے۔ جب سے شرافت نے لکھنا پڑھنا شروع کیا ہے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے۔ شرافت نے نواب کو اپنی صلاحیتوں سے متاثر کیا ہوگا اس لیے انھوں نے شرافت کو ایک بہت بڑے مجمعے کے سامنے، جو نواب صاحب کو سننے کے لیے جمع ہوا تھا، اپنی پہلی تقریر کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت شرافت صرف دس برس کے تھے مگر انھیں سیاست اور عوام کی پسندیدگی میں دل چسپی ہوگئی تھی۔ شرافت کہتے ہیں، ''یہ ایک تاریخی موقع تھا جب ایک دس برس کے بچے کو پچاس ہزار کے مجمعے کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ شرافت نے بڑی محنت سے اپنی تقریر کا متن تیار کیا، جس میں ان کے والد نے، جو خود اچھے مقرر تھے، اور علامہ رشید ترابی، جو ایک شیعہ رہنما تھے اور اپنی مجالس کی وجہ سے مشہور تھے، ان کی مدد کی تھی۔ یہ کوشش بہت کامیاب رہی ہوگی اس لیے کہ بقول شرافت ''تقریر کے بعد ایک بہت بڑا PCS افسر میرے والد کے پاس آیا اور مجھے بھی PCS افسر بننے کا مشورہ دیا۔ وہ میرے سیاسی لہجے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کہا تھا کہ اربابِ اقتدار نے اس تقریر کو پسند نہیں کیا ہوگا۔''

شرافت کو بہادر یار جنگ سے اپنے رشتے پر بہت فخر تھا جن کی شخصیت ان کے لیے ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی رہنما شخصیت جن قدروں پر یقین رکھتی تھی: وفاداری، ہندو مسلم برابری، مذہبی اقلیتوں کے حقوق اور مخالفین کی رائے کا احترام۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جو شرافت کے فلسفۂ زندگی کی مشعلِ راہ تھیں جو کامیاب پیشہ ورانہ زندگی میں ان کا نشانِ امتیاز تھیں۔

آزادی اور ہندوستانی افواج کے حیدرآباد پر حملے نے شرافت کو قائل کردیا تھا کہ ان کے مولد وطن میں ان کے لیے کوئی مستقبل نہیں اور انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست عزیز الرحمٰن کے ہمراہ مسلمانوں کے نئے وطن پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ قائدِاعظم کے انتقال کے کچھ دنوں بعد، ۱۶رنومبر ۱۹۴۸ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۱۹رتاریخ کو کراچی پہنچ گئے۔ شرافت نے بتایا کہ ''وہ اتوار کا دن تھا اور ہم نے ایک وکٹوریہ نامی سواری لے لی، جو آج بھی اِکادُکا دکھائی دے جاتی ہے۔ ہمیں حیرت ہورہی تھی کہ ایک ملک کا دارالحکومت ہونے کے باوجود اس کی سڑکیں سنسان کیوں ہیں۔ ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اتوار کا دن تھا، سڑکیں بالکل خالی مگر صاف ستھری تھیں۔ ان دنوں کراچی میں گاڑیاں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔''

شرافت کے والد اور دوسرے اہلِ خانہ حیدرآباد ہی میں رہ گئے تھے۔ شرافت بالکل اکیلے تھے مگر انھیں کوئی خوف نہیں تھا۔

شرافت کو اپنا وہ تجربہ بہت یاد آیا جب انھوں نے نوعمری میں پچاس ہزار کے مجمعے میں تقریر کی تھی، اور بقول ان کے اگر انھیں کوئی افسوس تھا تو یہی کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ آئے ہیں، جس میں وہ نوعمری کی یادیں بھی تھیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کے والد نے اس جگہ کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس شہر میں ان کی عزت بھی تھی اور وسیع رقبے پر مشتمل زمینیں بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک بڑی بیمہ کمپنی، 'نیو انڈیا' کے جنرل ایجنٹ بھی تھے۔ وہ پوری ریاست حیدرآباد کے لیے اس کمپنی کے ایجنٹ تھے اور ہمیشہ کمپنی میں سب سے زیادہ کاروبار کرنے والوں کی فہرست میں ان نام ہوتا تھا۔ شرافت کو نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے نفاست سے سجائے ہوئے آنے والے خوب صورت تحائف بھی یاد تھے جن پر بڑے بڑے لفظوں میں With Compliments to Nawab Noorullah Walajahi تحریر ہوتا تھا جن سے وہ بہت مرعوب ہوتے تھے۔ انھیں اس وقت خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ بھی انشورنس کی صنعت سے وابستہ ہوں گے، اور بہت کامیاب بھی ہوں گے۔ شرافت وکیل بننا چاہتے تھے، ایک بہت مشہور وکیل، اور انھیں امید تھی کہ ایک دن وہ ایک معروف اور باعزت بیرسٹر بن کے اپنے شہر واپس لوٹیں گے۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ آج انھیں ایک مناسب نوکری کی تلاش تھی۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں دو ہوائی کمپنیاں کام کررہی تھیں ان میں سے ایک تھی اورینٹ ایئرویز جو اصفہانی کی تھی اور دوسری تھی پاک ایئر جو پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کے داماد مجید ملک کی تھی۔ شرافت نے نائب افسر شماریات کی حیثیت سے پاک ایئر میں ملازمت کرلی۔ انھیں اس ادارے کی ملازمت اچھی لگی تھی۔ اس میں عبداللہ بیگ جیسے دل چسپ لوگ بھی کام کرتے تھے، جو پاکستان کے سب سے مشہور ہواباز تھے۔ پاک ایئر کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑگیا تھا اس لیے کہ اس کا ایک جہاز تباہ ہوگیا تھا جس میں پاکستانی فوج کے بہت اہم جنرل مارے گئے تھے۔ اب شرافت کو نئی ملازمت کی تلاش تھی، مگر ان جیسی اسناد رکھنے والے کے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

''مجھے یاد ہے کہ میں ۱۹۵۰ء میں ایسٹرن فیڈرل کے دفتر گیا تھا جو اُن دنوں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قریب لائڈز بینک بلڈنگ میں واقع تھا۔ یہ بڑی خوب صورت عمارت تھی۔ ای ایف یو کا دفتر پہلی منزل پر تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا اور اپنا کارڈ دیا، جس پر صرف میرا نام چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس وقت کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر ای سی آئیون نے انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ حالاں کہ میرا ان سے وقت طے نہیں تھا نہ میرے پاس کوئی سفارش تھی مگر وہ مجھ سے پندرہ منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے صرف یونہی کوشش کی تھی اس لیے کہ مجھے نوکری کی تلاش تھی۔ اور میں کئی بینکوں اور بیمہ کمپنیوں میں جا چکا تھا۔ میں ایوِن صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا اور

شاید وہ بھی مجھ سے متاثر ہوئے تھے اس لیے کہ فوراً ہی انھوں مجھے ملازمت کی پیش کش کردی تھی اور میں نے ۲۰ راگست ۱۹۵۰ء سے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ جی ہاں، آج سے ٹھیک سینتالیس برس قبل۔ ان دنوں بیمے کی صنعت کے زیادہ تر تجربے کار لوگ ای ایف یو ہی میں کام کرتے تھے۔ مسٹر بیکسٹر جنرل منیجر تھے اور مسٹر آئیون ان کے نائب تھے۔ بڑے بڑے کیبن ان کے دفتر تھے۔ ان کے سامنے وصال الدین، جو اس وقت لائف منیجر تھے، جناب اختر آزاد جو فائر ڈپارٹمنٹ کے کرتا دھرتا تھے، پھر مسٹر ہاشم میرین ڈپارٹمنٹ اور مسٹر تحسین احمد کلیمز ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ منیجر تھے۔

لائف ڈپارٹمنٹ میں پندرہ بیس افراد کام کرتے تھے اور مجھے اسی شعبے میں مقرر کیا گیا تھا۔ علی اکبر نام کے ایک صاحب جو بہت تجربے کار آدمی تھے انڈر رائٹنگ کرتے تھے اور مجھے تربیت کے لیے انھیں کے ساتھ کردیا گیا۔ مجھے جونیئر افسر کا عہدہ دیا گیا تھا جس پر میں ۱۹۵۲ء تک کام کرتا رہا۔ مسٹر ایس ایم شاہ نے، جو بعد میں یونیورسل لائف انشورنس کے جنرل منیجر بن گئے تھے، ازراہِ مہربانی، برٹش انشورنس ایسوسی ایشن کے وظیفے پر انگلستان جانے کا بندوبست کردیا۔ اس زمانے میں شاہ صاحب حکومتِ پاکستان کے انشورنس ڈپارٹمنٹ میں سپر نٹنڈنٹ بھی تھے اور پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری بھی۔ اس وجہ سے ان کے انگلستان میں رسوخ تھے۔ میں بے حد مسرور تھا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اسی زمانے میں مسٹر کے ایف حیدر نے مسٹر بیکسٹر سے کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کے عہدے کا اختیار لیا تھا۔ وہ بھی بہت مہربان تھے۔ وہ نہایت اچھے انسان تھے۔ مجھ سے ان کا سلوک باپ جیسا تھا۔ انشورنس میں وہ نو وارد تھے، اگرچہ وہ ای ایف یو کے بنیاد گزاروں میں سے ایک تھے۔ وہ مسٹر ای سی آئیون پر بہت اعتماد کرتے تھے اور دراصل انڈر رائیٹنگ اور کاروبار کے دوسرے معاملات کے ذمے دار تھے۔ میرے لندن کے قیام کے دوران انھوں نے میری بہت ہمت افزائی کی تھی۔ وہ اتنے بڑے افسر اور میں ایک چھوٹا سا جونیئر افسر۔ وہ کمبر لینڈ ہوٹل میں مقیم تھے جس کا ان دنوں کرایہ ایک پونڈ اور دس شلنگ تھا۔ میرے وظیفے کی رقم پانچ پونڈ فی ہفتہ تھی اس لیے مجھے ہوٹل کا کرایہ اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اُن سے دوپہر کے کھانے کی دعوت پر اصرار کیا جس پر انھیں بہت حیرانی ہو رہی تھی، مگر انھوں نے میری خاطر یہ دعوت قبول کرلی۔ میں نے انھیں لندن میں اپنی تربیت کے بارے میں بتایا اور اس بات پر وہ بہت متحیر ہوئے کہ میں برطانوی انشورنس کمپنیوں کے اتنے بہت سے بڑے افسروں سے ملاقات کرچکا ہوں۔ ان میں نارچ یونین اور پروڈنشیل کے جنرل منیجر شامل تھے۔"

شرافت نے لندن میں اپنے قیام سے خوب فائدہ اٹھایا اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے سب کچھ اپنی کوششوں سے کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کی شاہ صاحب نے ابتدائی ملاقاتوں کا اہتمام کرادیا تھا مگر شرافت نے اپنی ہنرمندی سے ان میں پیش رفت کو ممکن بنایا۔ شرافت پروڈنشیل انشورنس کمپنی میں تعینات تھے، پھر کچھ دنوں انشورنس ایسوسی ایشن میں، نارچ یونین، اٹلس انشورنس گروپ اور اسٹینڈرڈ میرین انشورنس کمپنی میں رہے، جو سب کی سب اوّل درجے کی کمپنیاں تھیں۔ شرافت کو بلجیم، فرانس، سوئٹزر لینڈ اور جرمنی کی انشورنس کمپنیوں کے لوگوں سے ملنے کے مواقع بھی ملے۔ ان میں سے بہت سے بین الاقوامی سطح کی کمپنیوں کے لوگ تھے۔ شرافت میں ہمت تھی کہ اپنے بل بوتے پر، مشکل حالات میں بھی وہ اپنے ساتھیوں سے کئی قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ لوگ جنھیں شرافت پیچھے چھوڑ گئے تھے، اس جارحانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے حیدرآبادی ریاستی نوجوان کو اسی لیے پسند نہیں کرتے تھے۔

مگر انھیں بھی انتظار اور موقعے کی تلاش میں رہنا تھا۔ جب وہ پاکستان واپس آرہے تھے تو بحری سفر میں ان کے ساتھ مجاہدِ آزادی سردار عبدالرب نشتر کے بیٹے جمیل نشتر تھے۔ یہ دونوں اور شاکر درّانی جو بعد میں اسٹیٹ بینک کے گورنر بنے تھے مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور Harrods کے قریب ایک ہوٹل میں ساتھ رہتے تھے۔ اور جب یہ تینوں اکٹھے کراچی کی بندرگاہ پر جہاز سے اترے تو جمیل نشتر کے لیے لائڈز بینک میں تقرری کا خط لیے کوئی بندرگاہ پر استقبال کے لیے موجود تھا۔ واپسی پر شرافت کو ایک جونیئر افسر سے ترقی دے کر لائف ڈپارٹمنٹ میں سپرنٹنڈنٹ بنادیا گیا تھا مگر ان کو مایوسی ہوئی تھی اس لیے کہ انگلستان میں دو سال قیام کے بعد واپسی پر وہ کسی بڑے عہدے کی

کے برعکس اسٹیٹ لائف کارپوریشن نے ان کے پیشہ ورانہ تجربے اور ان کی عمیق دانشوری سے کسبِ فیض کیا۔ اسٹیٹ لائف ان دنوں کسی پیشہ ور کے نہیں بلکہ ایک سرکاری افسر، مسٹر بیگ کے زیرِ انتظام تھی جنھوں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ حکومت کے زبردست دباؤ کے باوجود انتظامی اعلیٰ عہدوں پر سرکاری افسروں کا تقرر نہ کیا جائے۔ بیگ صاحب اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کارپوریشن کے چھ ایگزیکٹیو ڈائریکٹروں میں سے تین سابقہ ای ایف یو سے تھے، جن میں شرافت والا جاہی شامل تھے۔ یہ کارپوریشن پر ای ایف یو کے حاوی کردار کا ثبوت تھا جس کو کچل کر بنائے گئے اسٹیٹ لائف کے تین یونٹوں میں سے ایک تک محدود کر دیا گیا تھا۔ نئی کارپوریشن سرکاری طور پر یکم نومبر ۱۹۷۲ء میں وجود میں آچکی تھی۔ اس کے سامنے پچاس مختلف کمپنیوں، اور ان کے مختلف ماحول کو ایک ادارے میں ڈھالنا تھا تاکہ سب ایک ہی زبان میں بات کریں اور ایک ہی سمت میں سفر کریں۔ شرافت نے کہا کہ ''نیشنلائزیشن کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا اور پیشہ ور لوگوں کے لیے یہ بڑا چیلنج تھا کہ وہ ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیں۔ اور مجھ جیسے لوگوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا، اور یقین کیجیے کہ کارپوریشن کے کام کے لیے میں اتنا ہی وقت دیتا جتنا کہ میں ای ایف یو میں دیا کرتا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

میرے دوست نے بڑے کامیابی سے اسٹیٹ لائف کا کام کیا۔ ۱۹۸۱ء میں جب ان کو ۹ برس ہو چکے تھے، اس وقت کے چیئرمین ریٹائر ہوئے اور نئے چیئرمین کا تقرر ہوا۔ اس وقت شرافت والا جاہی سب سے سینئر ڈائریکٹر تھے۔ فیلو آف چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ بھی تھے اور انھوں نے سرکاری افسروں کی طرح اسٹاف کالج سے نہ جانے کتنی اسناد حاصل کر رکھی تھیں اور ان کے چیئرمین بنائے جانے کی تمام وجوہات موجود تھیں مگر افسوس کہ پھر سرکاری افسروں کے حلقے ہی سے نئے چیئرمین کا تقرر کیا گیا۔ شرافت نے خود سے کہا کہ اب بہت ہو چکا۔ اسی وجہ سے جب مسٹر بھیم جی نے، جن سے بہت قریب رہ کر وہ بیس برس کام کر چکے تھے، انھیں لندن میں نئی بنائی جانے والی کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنیوں کے گروپ میں شرکت کی پیش کش کی تو انھوں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور نئی سرزمین پر قسمت آزمائی کی خاطر یہ پیش کش فوراً قبول کر لی۔

مسٹر بھیم جی اور آغا حسن عابدی کے اشتراک میں نئی کمپنیاں بنی تھیں، جو عابدی صاحب کے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی بہنوں کی مانند تھیں۔ ۱۹۸۱ء جولائی کے مہینے میں شرافت ان کمپنیوں کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ کراچی میں ایف یو کے صدر نواب حسن کی معیت میں شرافت کو ان کمپنیوں کے مختلف بازوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں کاربار کی ممکنات تلاش کرنے کی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سفر کیے اور کافی تحقیقاتی کام کیے۔ وہ افریقا اور ایشیا کے مختلف ممالک میں گئے اور میونخ ری میں اپنے پرانے دوستوں سے ملے۔ مگر بعد کے حالات اتنے سازگار نہیں رہے جیسی کہ توقعات تھیں۔ بدقسمتی سے آغا حسن عابدی کی بنائی ہوئی مالیاتی سلطنت زمیں بوس ہوگئی اور ان کے ساتھ ہی یہ کمپنیاں بھی باقی نہ رہ سکیں۔ میں نے اس بارے میں پچھلے صفحات میں، اور بالخصوص روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اس واردات کے بارے میں شرافت والا جاہی کے اپنے الگ خیالات تھے، اور یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ انھیں اس میدان میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی حالاں کہ وہ ماضی میں ایک بہت خوب صورت پیشہ ورانہ زندگی گزار چکے تھے۔ ان کے خیال میں اگر یہ تجربے کامیاب ہو جاتے تو ایک نئی کاروباری دنیا وجود میں آسکتی تھی۔ وہ آج بھی اس شخصیت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں بینکاری کی نئی تاریخ رقم کرتے کرتے رہ گیا۔

شرافت کے الفاظ ہیں، ''میں آج بھی کہتا ہوں کہ عابدی صاحب ایک عظیم آدمی تھے۔ میں پاکستان کے لیے ان کی خدمات کے باعث ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ عابدی نے دنیا کی بینکاری کے نقشے پر پاکستان کا نام ثبت کر دیا۔ اور کوئی یہ کام نہیں کر سکا۔ قومی صنعت میں لیے جانے سے قبل بینکاری کی صنعت کی ترقی کے ذمے دار عابدی ہی تھے۔ ان کی اس تخلیق کی عدم موجودگی میں نہ یونائیٹڈ بینک اور نہ